58

دس ولی

سید بشیر احمد سعدی

مکتبۂ جدید۔ انارکلی۔ لاہور

دس ولی

سید بشیر احمد سعدی

مکتبہ جدید۔ انارکلی۔ لاہور

بار اوّل : ۱۹۶۵ء
طابع : مکتبہ جدید پریس۔ لاہور
ناشر : رشید احمد چودھری

ترتیب

۱۔ خواجہ حسن بصری	متوفی	۱۱۰ ہجری	۱۵
۲۔ جنید بغدادی	"	۲۹۸ "	۵۳
۳۔ مخدوم علی ہجویری	"	۴۶۶	۷۱
۴۔ عبدالقادر جیلانی	"	۵۶۱ "	۸۷
۵۔ خواجہ معین الدین چشتی	"	۶۳۳	۱۰۳
۶۔ فرید الدین گنج شکر	"	۶۶۴ "	۱۱۵
۷۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی	"	۶۶۶ "	۱۲۵
۸۔ نظام الدین محبوب الٰہی	"	۸۲۵ "	۱۳۴
۹۔ شیخ محمد المعروف میاں میر	"	۱۰۴۵ "	۱۴۹
۱۰۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی	"	۱۰۷۹ "	۱۶۲

تعارف

علامہ علاؤالدین صدیقی ایم اے چیئرمین اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان

○

عزیزم سید شبیر احمد سعدی سنگروری دینی ادب کو عوام تک آسان اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے میں ایک خاص حیثیت حاصل کر چکے ہیں "دس پیغمبر" کے عنوان سے انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر کتاب پہلے لکھ چکے ہیں اب "دس ولی" کے عنوان سے اکابر اولیاء کرام سے تعارف کرا رہے ہیں اولیاء کرام کے حالات زندگی کے علاوہ معارف تصوف پر بھی روشنی ڈالی ہے، اللہ تعالٰے سعدی صاحب کی محنت قبول فرمائے اُمید ہے کہ اہلِ ذوق کے لیے یہ کتاب مفید رہے گی۔

والسلام

احقر العباد علاؤالدین صدیقی عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، وائس پرنسپل ایم۔اے۔او کالج۔ لاہور

جناب سعدی کی تالیف "دس ولی" پیش نظر ہے۔ مذہبی زندگی کے کمال کی مثالیں اولیائے کرام ہی کے نفوس قدسیہ میں ملتی ہیں اور فضائل حیات کے واقعہ بننے اور قابل عمل ہونے کا دعویٰ انہی اکابر کو دیکھ کر باور آتا ہے۔ شخصیت کی نشوونما میں جتنا دخل شخصیات کے اثر و نفوذ کو ہے۔ اور کسی چیز کو نہیں۔ افکار وخیالات عقائد اور احکام سیرت کو اتنا متاثر نہیں کر سکتے جتنا اعلٰے فضائل اور عمدہ سیرت کی حامل شخصیت متاثر کرتی ہے۔ اولیاءکرام کے حالات کا مطالعہ بھی پسندیدہ سیرت پیدا کرنے میں موثر ہے۔ سیرت نگار اور قارئین دونوں عنداللہ ماجور ہوتے ہیں۔ اللہ پاک ان اکابر کے کمالات سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ الحمدللہ اوّلاً و آخراً۔

برہان احمد فاروقی

۶ر جنوری ۱۹۶۵ء

اِنتساب

میچلیس ڈیزل انجن لمیٹڈ لاہور کے جواں سال ڈائریکٹر محب محترم نصیر احمد صاحب قریشی کے نام

دیباچہ

سرِ دلبراں وہ ملت جس کا خدا ایک، کتاب ایک، خدا کا آخری رسول ایک، پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کا شروع سے آخر تک نام بھی ایک یعنی مسلمان اولیاء اللہ کی تمام تر کوششوں کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ ملتِ واحد یعنی مسلمان آپس کے لڑائی جھگڑے ختم کر کے ایک ہو جائیں۔ سیاست اور حکومت کے خرخشوں میں اُلجھنے کی بجائے ان سے علیحدہ ہو کر سب مل کے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔

اولیائے کرام نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے بگڑے ہوتے احوال کی اصلاح کی اور توجہ دی وہاں دوسری طرف اپنے حُسنِ عمل اور جاذبِ نظر کردار سے لاکھوں انسانوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کیا۔

اِس کتاب میں بزرگانِ دین کے خوارقِ عادات و کرامات کی بجائے ان کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کے نتیجے میں خلقِ خدا نے اِن کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

کوششوں کے سلسلے میں بزرگانِ دین کی سیرت کے اِن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کے سبب اِن کی کوششیں بار آور ہوئیں۔

بزرگانِ دین کے سوانح مستند تاریخوں اور تذکروں سے واقعات و حقائق کی روشنی میں لیے گئے ہیں۔ اختلافی مسائل کو ہوا دینے کی بجائے وحدتِ ملی پر زور دیا گیا ہے۔

حدیثِ دیگراں تفرقہ کے اسباب۔ اگرچہ عقائد و اعمال کے اعتبار سے

بعض بعض صحابہ کا بھی آپس میں اختلاف رہا ہے۔ لیکن وہ اس بنیاد پر ایک دُوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے ایسا کوئی نام یا مکتبہ فکر ہی اختیار کیا جس سے ان کی آرا کا باہمی تضاد ظاہر ہو۔ یا ان کے باہمی فروعی اختلافات اُبھر سکیں۔

تمام حضرات ایک ہی نام "مُسلمان" سے پکارے جاتے اور آپس میں ایک دُوسرے کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے تھے لیکن جب اختلاف کی بات اعمال و عقائد سے چل کر حکومت اور سیاست کے مخصوص تنگ آگئی تب اس وقت مسلمانوں کی اجتماعی قوت میں ضعف آنا شروع ہوگیا اور وحدت ملی پارہ پارہ ہونے لگی۔

پہلا فرقہ

۲۷ ہجری میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے جناب معاویہ سے صُلح کر لی اور حکم کا فیصلہ مان لیا تو ان کے ساتھیوں میں سے کئی ہزار آدمی ان سے الگ ہوگئے ان کا نعرہ تھا لاطاعۃ غیراللہ یعنی مذہب کے حق و باطل کا فیصلہ ثالث اور حکم کی رائے پر نہیں ہوسکتا چنانچہ مسلمانوں میں یہ وہ پہلا فرقہ ہے جو خالصتہً سیاسی وجوہ پر قائم ہوُا۔

تاریخ اسلام میں مسلمانوں کے اس سب سے پہلے گروہ کو جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی رفاقت میں داخل ہوکر پھر ان کے حلقے سے نکل گیا خوارج کہتے ہیں۔

بعض لوگ اس فرقے کو معتزلہ بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ بعض لوگوں نے چند ایک صحابیوں کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ انھوں نے چونکہ اپنے آپ کو حضرت علی کی قیادت یا امامت سے خارج کر لیا اس لیے انھیں حضرت علی کے سونپے ہوئے عہدوں سے معزول کیے جانے کے سبب معتزلہ کہتے ہیں۔ لیکن واقعتہً بات یہ بھی درست نہیں۔

دراصل معتزلہ کا گروہ خارجیوں کے بعد مسلمانوں کا دُوسرا فرقہ ہے جو حضرت خواجہ حسن بصری کے زمانے میں قائم ہُوا۔ ہرچند اس تحریک کے محرکات بھی سیاسی ہیں۔

تاہم ان کے مذہب کی بُنیاد "عقلیت" پر ہے یعنی معتزلیوں کے عقائد میں فلسفیانہ خیالات اور عقلی استدلال پیدا ہو۔

مُسلمانوں میں رائے کے اختلاف کے سبب الگ الگ فرقے اور ان کے جُدا جُدا نام قائم ہونے کی ابتدا، خوارج ہی سے ہوئی۔ اِس سے پہلے اِسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ بیان میں آیا ہے کہ باعتبارِ عقیدہ خارجیوں کے نزدیک گُناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ جو لوگ ان کے ہم خیال نہیں تھے وہ ان کے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج تھے۔ بعد کو اِس "ہم خیالی" کے تنگ نظریے اور "متشدد" جذبے نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ ہر فریق اپنے مخالف گروہ کو باطل کا پیرو سمجھنے لگا، اور خُود کو حق بجانب۔

اِختلافِ رائے میں تحمّل اور بُردباری کو راہ نہ دینے کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ بھائی بھائی کے خُون کا پیاسا ہوگیا۔ اِس حقیقت کا جواز پیدا کرنے کے لیے کہ مُسلمان کا مُسلمان پر خُون بہانا حرام ہے۔ ایک دُوسرے کو پہلے ہی مرحلے پر کافر و زندیق اور ملحد بنا دیا گیا۔

سنہ ۶۱ھ کا خُونیں معرکۂ کرب و بلا کسے معلوم نہیں یہ اختلافِ رائے پر جنگ و جدل اور قتل و غارتگری کی انتہا ہے اور یہ مُعاملہ صرف یہیں پہ آکر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اِس کے بعد بھی مُسلمانوں میں برابر تلوار چلتی رہی۔

وہ دین جس نے عالمگیر برادری، بھائی چارگی اور آپس میں برابری کا علَم بلند کیا تھا۔ نت نئی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں سے اس کے اصُول سہ گانہ یعنی حریت، اخوت اور مساوات کا پرچم خُود مُسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے سرنگوں ہونے لگا۔

ایسے عالم میں تسلیم و رضا کی خوگر، صبر و استقامت کی پیکر اور کاشانۂ رسالت میں حاضر ہونے والی وہ آنکھیں اسلام کے لیے فرشِ راہ ہوگئیں جو محمد رسُول اللہ کے دین کو سرخرو اور سربلند دیکھنا چاہتی تھیں۔

یہ نکتہ بیں، نظر آفریں، اور حیات پرور آنکھیں اُمت کے ان پاک اور نیک لوگوں

کی آنکھیں تھیں جن کے دل و دماغ اور ہاتھ پیر کبھی خُدا کے حکموں کے خلاف نہیں چلے اور نہ اُنھوں نے کسی مفاد و جلب منفعت کے لیے کبھی کوئی غلط راستہ اختیار کیا۔

اولیا اللہ کی مساعی

ان بزرگوں کو جناب محمد رسُول اللہ کے طریقہ پیغام رسانی کا علم تھا وہ بات پہنچائی جانتے تھے اور انھیں حق بات کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔ چنانچہ جذبہ ایمان سے سرشار ہوکر ان بزرگوں نے کسی امتیاز و تخصیص کو جائز نہ سمجھتے ہُوئے مُسلمانوں کو آئے دن کی تفریق و انتشار سے بچانے کی مقدور بھر کوشش کی دین اسلام کی خدمت کرنے والے یہ پاک نفوس جو مجلس نبوی کے تربیت یافتہ تھے۔ جن کو بارگاہِ نبوّت سے علم و عمل کی سعادتیں میسر آئیں۔ پہلے دور میں صحابی کہلاتے۔ دُوسرے دور میں جن بزرگوں نے صحابیوں سے استفادہ کیا وہ تابعی کہلائے پھر تیسرے دور میں تابعین سے جن بزرگوں کو علم نصیب ہُوا انھیں تبع تابعین کہا گیا۔ ان ادوار کے بعد اب اسلامی زندگی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس کو سیرتِ اولیاء کہتے ہیں۔

یعنی جن علمائے اسلام و بزرگانِ دین نے تابعین سے اکتساب کیا اور ان سے فیض یاب ہُوئے۔ انھیں اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوست کہا جاتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں انہی اللہ کے دوستوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی شبانہ روز کوششوں قول و فعل کی تطبیق اور علم و عمل کی تطہیر اور بے لوث کاوشوں سے چمنِ محمدیؐ پھولا پھلا اور سرسبز و شاداب ہُوا۔

عام طور پر جب ہم اولیائے کرام کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں زیادہ تر ان کے خوارقِ عادات اور کرامات پر زور دیتے ہیں۔

اسی طرح سے جب ہم اولیائے کرام کے زہد و عبادت کو بیان کرتے ہیں تو اس سے ترکِ علائق دنیوی مُراد لیتے ہیں۔

بلاشبہ اولیائے کرام صاحبِ کرامت تھے مگر ان میں سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ وہ

صاحب علم و عمل تھے۔ تقوے اور طہارت کی سعادت انھیں حاصل تھی احکام شرعی کی بجاآوری انھیں جان سے پیاری تھی سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے نزدیک شریعت کی حدود سے تجاوز کرنا کفر تھا۔ اور خدا کی محبت میں مرمٹنا عین اسلام۔ چنانچہ یہی وہ کرامت ہے جس نے ان کی ذات کو بابرکت بنادیا اور ان میں بلا کی جاذبیت اور غضب کی دل کشی و کشش پیدا کی کہ لوگ دور دور سے ان کے پاس آپ سے آپ کھنچے چلے آتے اور فیض پاتے۔ ان بزرگوں کی زبان میں ایک اثر تھا وہ منہ سے جو کہتے ہو جاتا۔ ان کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیتے غرض جو بات کہتے اسے اُدھورا نہ رکھتے مختصراً یہ کہ اولیائے کرام کی ذات بابرکت اس شعر کی جیتی جاگتی تفسیر ہے۔

گفتۂ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اسے دل سے چاہتے ہیں اللہ ان کو چاہتا ہے۔ جو اللہ کے ہو جاتے ہیں۔ اللہ ان کا ہو جاتا ہے۔ جو اسے یاد کرتے ہیں اللہ انھیں یاد رکھتا ہے۔

یہ بات اللہ کے دوست جانتے ہیں کہ اس کی رحمت بے حساب ہے اس کی بخشش کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اس کی بارگاہ سے جو مانگو سو ملتا ہے۔ لیکن ملتا اسی کو ہے' اس کی رحمت سے فیض وہی پاتے ہیں جو اس کے احکام پر چلتے۔ نیک کام کرتے اور اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اولیائے کرام نے دنیا کو دین پر کبھی ترجیح دی ہے نہ دنیا سے ترک تعلق کیا ہے جو بزرگان دین کثرت سے عبادت و ریاضت کرتے ہیں ہر وقت خدا کا ذکر کرتے اور اس کی بارگاہ میں جھکے رہتے ہیں۔ یہی وہ پاک نفوس ہیں جنھیں اللہ کی محبت میں فنا ہو کر بقا ملی۔ مگر جن لوگوں نے اولیاء کرام کو سطحی نگاہ سے دیکھا وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا سے

ترک تعلق ولایت کی پہلی شرط ہے چنانچہ ایسے لوگوں نے گویا رہبانیت کو اختیار کر لیا جس سے ان کی تمام ریاضت و عبادت بے نتیجہ رہتی ہے۔

جو لوگ اولیائے کرام کی حیات مبارکہ میں ان کے خوارق عادات و کرامات کو تلاش کرتے ہیں اور انہی کو اولیائے کرام کی ولایت کی دلیل سمجھتے ہیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ ان کی نگاہوں سے اولیائے کرام کی سیرت کے وہ پہلو اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جن کے باعث اسلام پھیلانے میں انہیں اکثر نامساعد حالات میں کامیابی ہوئی ہے حقیقت میں یہی اولیائے کرام کی سب سے بڑی ہزار کرامتوں کی ایک کرامت ہے۔

جناب شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک کرامت وہ ایمان ہے جس سے یقین ابھرے دوسری کرامت وہ عمل ہے جو بار آور ہو۔ جسے یہ دونوں کرامتیں نصیب ہوئیں اگر پھر وہ کسی اور کرامت کا طالب ہوا۔ وہ شخص یا تو فریب خوردہ اور جھوٹا ہے یا علم و عمل میں غلط کار ہے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر مہنوی کہ آپ کی ذات حلقہ صوفیہ میں سر آمد روزگار تھی۔ کسی نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی بڑی بات نہیں۔ جل مرغ اور سیس مولا وغیرہ بھی پانی پر چلتے ہیں۔ کسی نے کہا فلاں ہوا میں اڑتا ہے آپ نے فرمایا، تو کیا ہوا مکھی اور کوا بھی اڑتا ہے، کسی نے کہا فلاں شخص ایک لمحہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پہنچ جاتا ہے، آپ نے فرمایا شیطان بھی ایک لمحہ میں مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتا ہے۔

آپ نے فرمایا ان باتوں کی کوئی وقعت نہیں بلکہ قدر و قیمت کی بات یہ ہے کہ کوئی شخص دنیا اور دنیا کے لوگوں سے لین دین، میل جول اور تعلقات بھی رکھے اور اس کے ساتھ خدا کی یاد سے غافل بھی نہ ہو۔

سید بشیر احمد سعدی ستگوری

خواجہ حسن بصری

ولادت : ۲۱ ھجری ۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ۔ بصرے میں پرورش پائی ۔ اسی مناسبت سے بصری کہلاتے ۔ آپ کے والد محترم کے نام کے بارے میں اختلاف ہے ۔ بعضوں نے یسار لکھا ہے ۔ لیکن موسیٰ بن راعی بن خواجہ اویس قرنی بہت مشہور نام ہے ۔

یہ بات تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق لکھی ہے کہ جب خواجہ صاحب پیدا ہوئے تو آپ کے والد محترم جناب موسیٰ بن راعی انہیں دعائے خیر و برکت کے لیے جناب عمر فاروق کی خدمت میں اٹھا لائے ۔ جناب فاروق نے آپ کو دیکھا تو فرمایا واللہ کتنی پیاری صورت ہے ، ماشاءاللہ بڑا ہی خوبرو اور حسین و جمیل بچہ ہے ۔ اس کا نام حسن رکھو چنانچہ جناب خواجہ نے اسی نام سے شہرت دوام پائی ۔

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں جناب حسن کی کنیت ابوسعید بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ جواہر فروشی کے سبب آپ حسن لولوئی کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں لیکن واضح رہے خواجہ حسن بصری کے علاوہ اس نام سے ایک بزرگ ۲۰۴ھ میں جناب امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد بھی ہوئے ہیں جو اپنے وقت کے بڑے ہی باکمال امام تھے ان کے نام کی وجہ تسمیہ بھی وہی ہے جو حضرت خواجہ کے نام کی ہے ۔ (صفحہ الحسن بن زیاد لولوئی متوفی ۲۰۴ھ)

خواجہ حسن بصری کی والدہ محترمہ خیرہ حضرت ام المومنین ام سلمہ کی خادمہ تھیں ۔ ام سلمہ خواجہ کو بہت پیار کرتی تھیں ۔ فریدالدین عطار تذکرۃ الاولیا میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہ کے یہاں تشریف لائے ۔ آپ خواجہ کو گود میں لیے بیٹھی تھیں حضور نے

استفسار فرمایا۔ آپ نے یہ کہہ کر کہ حیزہ کا بچہ ہے حضور کی گود میں ڈال دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ ۱۱ ہجری میں رحلت فرمائی۔ خواجہ حسن بصری ۲۱ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اگر یہ اشارہ طریقہ اویسیہ کی طرف ہے تو مولف کو چاہیئے تھا کہ وضاحت کرتا۔

بیعت

یوں تو جناب خواجہ نے بڑے بڑے صحابیوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ان کی صحبت سے فیض اُٹھایا ہے۔ لیکن علوم ظاہری و باطنی آپ نے بالخصوص حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہی سے حاصل کئے۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ آپ جناب امام حسن کے مُرید و شاگرد تھے ممکن ہے آپ دونوں ہی کے مُرید و شاگرد ہوں۔ جن لوگوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ آپ نے جناب علی کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور آپ کو ان سے علوم باطنی تلقین ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جناب علی کی شہادت کے وقت آپ صرف اُنیس ۱۹ برس کے تھے۔

مگر یہ دلیل درست نہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر اولیائے کرام اور آئمہ دین نے اس سے بھی کم عمر میں جملہ علوم دین میں تکمیل پائی ہے لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ ایک اُنیس ۱۹ برس کا نوجوان تلقین علم و آداب میں بارگاہ مرتضوی سے ضرور بہرہ ور ہوا ہے۔

صاحب تحفۃ الابرار نے لکھا کہ حضرت حسن بصری، چودہ برس کی عمر تک مدینہ منورہ میں رہے اسی طرح جناب علی کرم اللہ وجہہ، بھی چودہ برس تک مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے حتیٰ کہ جناب عثمان کی شہادت پر جب لوگوں نے آپ سے خلافت قبول کرنے پر بہت ہی اصرار کیا اور آپ خلیفہ بنائے گئے۔ اس وقت بھی آپ مدینہ ہی میں رہتے تھے بلکہ خلیفہ ہو جانے کے بعد بھی چند مہینوں تک رہے۔ پس یہ بیان اس بات کے لیے کافی ہے کہ آپ حضرت علی کے مُرید اور شاگرد تھے۔

علاوہ ازیں ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت علی کے دوران قیام بصرہ میں آپ نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے تبرکاً طہارت سکھا دیجیئے۔ چنانچہ جناب علی کرم اللہ وجہہ، نے ایک طشت منگوا کے آپ کو وضو کرنا سکھایا۔ بصرے میں وہ مقام جہاں یہ واقعہ ہوا آج تک باب الطشت کے نام سے مشہور ہے۔

پس ان حالات کی روشنی میں یہ بات قطعی واضح ہے کہ خواجہ حسن بصری کو جناب علی کرم اللہ وجہٗ سے شرف تلمذ کرنے اور بیعت کی سعادت حاصل کرنے کا ضرور موقع ملا ہے۔

اس کے علاوہ ایک شہادت یوں بھی ملتی ہے کہ بصرہ کے دورہ پر جب حضرت علی بصرے کی مسجد میں گئے تو اس وقت آپ نے تمام واعظین کرام کو وعظ و تلقین سے روک دیا تھا۔ لیکن جناب خواجہ حسن بصری کو جو اس وقت وعظ و تلقین فرما رہے تھے۔ نہیں روکا اس واقعے سے جناب خواجہ کی عظمت شان کا بھی ایک اندازہ ہوتا ہے۔

فضیلت علمی امام زہریؒ (ولادت ۵۱ ھ۔ وفات ۱۲۴ ھ) اعلام تابعین سے ہیں۔ متعدد اصحاب رسول سے تعلیم پائی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے عالم صرف چار ہی ہیں۔ مدینہ میں المسیبؒ شام میں مکحولؒ کوفہ میں شعبیؒ یہ علامہ شعبی وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اوّل اوّل جناب امام اعظم ابو حنیفہ کو حصول علم کی ترغیب دی۔ بصرے میں جناب امام المتصوفین والعارفین خواجہ حسن بصریؒ۔

تمام سیرت نگاروں نے یہ بات بالاتفاق لکھی ہے کہ خواجہ حسن بصری اگرچہ نسلاً حبشی تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت بڑا فصیح اللسان بنایا۔ حجاج بن یوسف آپ کی فصاحت کے مقابلے میں خود کو ہیچ سمجھتا تھا۔

علامہ ذہبی نے اسلام کے دوسرے اور تیسرے دور میں جن حاملین حدیث کا ذکر کیا ہے۔ ان کی تصنیفات و ملفوظات کے مستقل ترجمے لکھے اور انہیں ترتیب دیا ہے۔ ان میں جناب خواجہ سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ ذہبی نے خواجہ کے مفصل سوانح بھی تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر نکلسن نے لٹریری ہسٹری آف دی عرب میں لکھا ہے کہ اسلام کے دور اوّل میں جن اولیائے کرام پر خوف الٰہی طاری رہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی جباریت و قہاریت سے لرزہ براندام رہنا ان کی پہچان قرار پا گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے گریہ وزاری کرنا اور گناہوں کے خیال سے مضطرب الحال رہنا جن اولیائے کرام کے بارے میں خاص زور دے کر بیان کیا جاتا ہے۔

ان میں جناب خواجہ حسن بصری امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

معرکہ کربلا اور اس کے بعد بھی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنے والوں نے قتل و غارتگری کا جو بازار گرم کیا جناب خواجہ اسے ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ یہ طریقہ ہی موثر ہو سکتا تھا۔ جناب خواجہ نے مسلمانوں کے ذہن کا دنیا سے رُخ پھیرنے کے لیے دین میں کمال زہد و اطاعت کی بنیاد رکھی۔ الفت دنیا کی سخت مذمت کی اور یہاں تک نفرت کی کہ دنیا کی محبت کو ایمان کی کمزوری قرار دیا۔

مسلک

لیکن خواجہ حسن بصری نے دنیا اور دنیا والوں کے خلاف جو مہم شروع کی تھی اور لوگوں کو دنیا کی بجائے آخرت کی فکر کرنے پر متوجہ کیا تھا اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو رھبانیت کی طرف بلاتے اور تارک الدنیا ہونے کی تعلیم دیتے تھے بلکہ اس کا مقصد فقط یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو اقتدار کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور استحکام سلطنت کے لیے ہر طرف خون خرابہ ہو رہا تھا وہ رُک جائے اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ لوگ دین کو دنیا کے لیے داؤ پہ لگانے کی بجائے دنیا کو دین پہ لگا دیں۔

دراصل زہد و عبادت، گوشہ تنہائی، اور اللہ کے خوف سے روتے رہنے کی جو بنیاد خواجہ حسن بصری نے رکھی وہ آپ کے زمانے کے سیاسی احوال کا نتیجہ ہے۔ ایک اعتراض تجرد پسند کرنے کا جناب خواجہ پر ہو سکتا ہے مگر اس کا سبب بھی وہی احوال ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اور خواجہ کو دن رات یہی فکر تھی کہ ان کی بداحوالی کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے غرض آپ کو یہی خیال رہتا اور یہ آپ کی طبیعت پر اتنا حاوی ہو چکا تھا کہ تمام عمر آپ کو کسی نے کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔

مُسلمانی کی تعریف

داراشکوہ نے لکھا ہے کہ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ مسلمانی کی تعریف کیا ہے۔؟ اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔ جواب میں ارشاد فرمایا "مسلمانی در کتاب و مسلماناں در گور"۔ یعنی مسلمانی کتاب میں ہے اور مسلمان قبر میں ہیں۔

پھر آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ یا حضرت ہمارے دل سوئے ہوئے ہیں آپ کے ارشادات اور پند و نصائح کا ان پر اثر کیوں نہیں ہوتا ہمیں اس کے لیے کیا علاج کرنا چاہیئے۔ فرمایا اگر دل سوئے ہوئے ہی ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی انہیں جھنجوڑ کر جگایا جا سکتا تھا۔ رونا تو یہ ہے کہ دل مر چکے ہیں اب انہیں کتنا ہی جھنجوڑو جگانے کی کوشش کرو یہ بیدار نہیں ہو سکتے۔

جناب خواجہ نے مسلمانوں کو دنیا اور صرف دنیا ہی کے بن کے رہ جانے پر بڑی سختی سے رد کا اور خلاف پیمبر چلنے سے منع کیا۔ آپ کی نظر قرآن حکیم اور حدیث نبوی کی تفصیل پر تھی اس لیے آخرت کی زندگی آپ کے نزدیک گویا آنکھوں دیکھی چیز تھی دنیا کی بتہات اور چاہت نے مسلمانوں کو دین سے غافل بنا دیا تھا اور وہ آخرت کی زندگی کو بھولتے جا رہے تھے۔ آپ نے انہیں جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ انہیں چونکایا اور بتلا دیا کہ تم صرف زبان ہی سے اقرار کر لینے پر مسلمان نہیں بن سکتے مسلمان اور کامل مسلمان بننے کے لیے سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جن حقائق کا تم دل سے اقرار کرتے ہو ان پر دل کے ساتھ پورا پورا عمل بھی کرو۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جناب خواجہ کا بیان درد و کرب اور سوز و گداز سے پر ہوتا یہی سبب تھا کہ جو بات آپ کے منہ سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں تیر کی طرح اترتی چلی جاتی آپ کی زبان مبارک میں غضب کا اثر تھا جو ایک مرتبہ کہہ دیتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو ایک خلق خدا امام زمانہ صاحب کرامت اور مستجاب الوقت ولی تسلیم کرتی ہے۔

ناپاک آنسو

ایک روز آپ اپنی عبادت گاہ کے بالاخانے پر بیٹھے رو رہے تھے اور کثرت گریہ سے آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ ایک شخص نیچے سے گزرا اس کے اوپر چند آنسو گر گئے اس نے اوپر دیکھ کر پوچھا اے شخص یہ قطرے پاک تھے کہ ناپاک۔ آپ نے فرمایا اے بھائی یہ مجھ گنہگار کے ناپاک آنسو ہیں۔ انہیں دھو ڈال۔

جائے عبرت

جنازے کے ساتھ چلنا آپ کے نزدیک فرض اولی تھا۔ ایک مرتبہ کسی کے جنازے میں شریک تھے جب لوگ اسے قبر میں اتار چکے اور گور کر

واپس آنے لگے تو آپ ایک جگہ پہ بیٹھ گئے اور لوگوں سے فرمایا اے دنیا کے پرستارو، مال و دولت کے متوالو، دیکھ لیا تم نے آدمی کا انجام، یہ جگہ دنیا کا آخری مقام اور آخرت کی پہلی منزل ہے پھر کیا ناز اور کیا غرور اس دنیا پر جس کا انجام بالآخر یہ ہے سن لو کہ یہ دنیا جائے عبرت ہے۔

طلب آخرت ایک مرتبہ آپ نے خادم سے فرمایا کہ افطاری کے لیے بازار سے روٹی اور مچھلی کے کباب لے آؤ، خادم نے تعمیل کی جب افطاری کا وقت آیا تو آپ نے خادم سے فرمایا۔ یہ کباب اور مزے کا کھانا مجھ فقیر سے اس کا کیا تعلق؟ اس نے عرض کیا کہ آپ ہی نے تو فرمایا تھا آپ نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی۔ بار الہا میں نے دنیا کی نعمتوں پہ دھیان دیا مجھ سے بھول ہو ئی، میرا نام کہیں درویشوں کی فہرست سے مٹا نہ دینا۔

انکسار ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ وہاں ایک حبشی کو دیکھا کہ ایک عورت کو پہلو میں لیے بیٹھا ہے اور اس کے قریب ہی شراب کی ایک بوتل پڑی ہے وہ خود بھی پی رہا ہے اور عورت کو بھی پلا رہا ہے۔ آپکے دل میں خیال گزرا کہ یہ شخص اگرچہ شراب پی رہا ہے تاہم مجھ سے ہر حال میں بہتر ہے پھر سوچا کہ بہتر کیونکر ہو سکتا ہے یہ تو شراب پی رہا ہے اتنے میں آپ نے دیکھا کہ مال و اسباب سے لدی ہوئی ایک کشتی آ رہی ہے جب وہ کشتی حبشی کے قریب آئی تو ڈوب گئی جس میں مال و اسباب کے علاوہ سات آدمی بھی تھے جو غوطے کھانے لگے حبشی فوراً دریا میں کود پڑا۔ اور انہیں باہر نکال لایا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اس خیال سے توبہ کر لی اور دریا میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی طرح خود بھی حبشی کی اس جرات کے طفیل دریائے خود بینی سے نکل آئے۔ اور پھر آپ نے تمام عمر خود کو رذیل سے رذیل اور گنہگار سے گنہگار آدمی سے بھی کبھی اونچا نہیں سمجھا بلکہ خود کو اس سے کم تر ہی خیال کرتے رہے۔

خدا کی محبت ایک مرتبہ ایک خوبصورت عورت ننگے سر، ہاتھ منہ کھولے غصہ میں بھری ہوئی آپ کے پاس اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی۔ آپ نے فرمایا! اے نیک بخت

پہلے اپنے سر منہ کو ڈھانپ لے پھر شکایت بھی کر لینا عورت شرمندہ ہوئی اور کہا معاف کیجیے میں اپنے شوہر کی محبت میں از خود رفتہ ہو گئی کہ مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔ آپ نے اس کی یہ بات سُن کر دل میں کہا اے حسن اگر تو بھی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی دوستی میں ایسی ہی محویت سے کام لیتا تو تجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ اس عورت کے سر پہ کپڑا ہے یا نہیں!

اعتراض سے علیحدگی ایک شخص کے بارے میں لوگوں نے شکایت کی کہ وہ نماز با جماعت میں شامل نہیں ہوتا اور اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا اے شخص تجھے ایسا کونسا ضروری کام آ پڑا جو تجھے نماز با جماعت میں شریک ہونے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں باز رکھتا ہے۔ اس نے عرض کیا۔ میری کوئی سانس اور انسانیت کا کوئی لمحہ معصیت و گناہ سے خالی نہیں اس لیے میں خدا کی بارگاہ میں گریہ زاری میں مصروف رہتا ہوں آپ نے فرمایا اے شخص تو مجھ سے بہتر ہے اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے۔

حق گوئی و بے باکی ایک روز آپ وعظ کہہ رہے تھے۔ اتفاقاً حجاج بن یوسف شمشیر برہنہ لیے چند سپاہیوں کے ساتھ ادھر آنکلا۔ ایک شخص اس مجلس میں تھا۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج حسن بصری کا امتحان کرنا چاہیے یعنی دیکھنا چاہیے کہ حضرت حسن حجاج کے سامنے بھی وعظ میں مشغول رہتے ہیں یا اس کی تعظیم کے لیے وعظ سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں چنانچہ حجاج آپ سے قریب آیا اور چاہا کہ آپ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی تعظیم کیلئے کھڑے ہوں لیکن آپ نے حجاج کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اسی طرح وعظ فرماتے رہے تب اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ حسن واقعی حسن ہیں جب آپ وعظ کہہ چکے تو حجاج آپ کے پاس گیا اور مصافحہ کر کے لوگوں سے کہنے لگا۔ اے لوگو اگر تم کوئی مرد دیکھنا چاہو تو حسن کو دیکھ لو۔

طریقۂ ریاضت کہتے ہیں آپ کے ایک مرید کی یہ حالت تھی کہ جب قرآن حکیم کی کوئی آیت سنتا تو بیہوش ہو جاتا آپ نے فرمایا کہ تم جو کام کرتے ہو اس میں اس

بات کا خیال ضرور رہنا چاہیے کہ آواز ظاہر نہ ہونے پائے کیونکہ آواز کے ظاہر ہوتے سے ریاکاری معلوم ہوتی ہے۔ مکر و ریا سے انسان ہلاکت میں پڑ جاتا ہے اور جب انسان پر یہ حالت طاری نہ ہو اور وہ یہ حالت ارادہ کر کے بنائے تو اسے وعظ و نصیحت سے مطلق فائدہ نہیں پہنچتا۔

توکل ایک مرتبہ عمر بن عبدالعزیز نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں درخواست کی کہ آپ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمائیں جس سے مجھے ہر کام میں مدد ملے آپ نے جواب میں لکھا کہ اگر خدا تمہارا مددگار ہے تو چاہیئے تمہیں کہ بالکل بے خوف رہو اور اگر وہ مددگار نہیں، تو چاہیئے تمہیں کہ کسی سے امید نہ رکھو۔

مسلمانوں کی حالت ایک روز آپ نے اپنے دوستوں اور مریدوں سے کہا کہ تم لوگ صحابہ کی مانند ہو۔ سب لوگ خوش ہوئے۔ پھر آپ نے فرمایا میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم سیرت و کردار کے لحاظ سے ان کے مثل ہو بلکہ یہ کہ تمہاری صورت ان سے ملتی جلتی ہے۔ صحابہ کی یہ حالت تھی کہ تم اگر ان سے ملتے تو ان کو دیوانہ سمجھتے اور اگر صحابہ کرام تمہاری حالت کو دیکھتے تم میں سے کسی کو بھی مسلمان خیال نہ کرتے کیونکہ وہ حضرات اتنے بڑے اعلیٰ درجے کے مالک تھے کہ گھوڑوں پر سوار پرندوں کی طرح اڑتے اور ہوا کی طرح تیز چلتے ہوئے دنیا سے چلے گئے اور ہم ان لوگوں میں ہیں جو ایسے گدھوں پر سوار ہیں جن کی پشت زخمی ہے اور اس کی تکلیف سے چلاتے ہیں اور چلنے پر مجبور ہیں۔

آپ نے فرمایا انسان دنیا سے تین حسرتیں لے کر جاتا ہے ایک یہ کہ مال و دولت جمع کرنے سے آسودہ نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ تیسرے یہ کہ آخرت کے سفر کا سامان مہیا نہ کیا۔

تقویٰ آپ نے فرمایا ورع و پرہیزگاری کے تین درجے ہیں ایک یہ کہ غیظ و غضب کی حالت میں بھی سچ بات کہے۔ سچ کو ترک نہ کرے۔ حق بات اختیار کرے دوسرے یہ کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے انہیں پابندی کے ساتھ ادا کرتا رہے تیسرے یہ کہ جن باتوں

کی ممانعت ہے انہیں کبھی ہاتھ نہ لگائے۔

عہد خواجہ حسن بصری کے علمی مسائل

جناب خواجہ حسن بصری کا زمانہ ولایت دو اعتبار سے مشہور ہے ایک تو یہ کہ آپ کے وقت میں معتزلہ کا گروہ پیدا ہوا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ کے زمانے کے زاہدوں، عابدوں اور گوشہ نشینوں نے صوفی کا لقب پایا اور آگے چل کر اس سلسلے کے جو دوسرے بزرگ پیدا ہوئے انہوں نے تصوف کے مسلک کی باقاعدہ تنظیم کی اور اس کے فروغ و اشاعت کے لیے تصنیف اور تالیف کا آغاز کیا۔

معتزلہ معتزلہ کے گروہ سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ استحکام سلطنت کے لیے امویوں نے ہر طرف خونریزیاں شروع کی ہوئی تھیں جس کے باعث ملک میں سخت بے دلی۔ بے اطمینانی اور خوف و ہراس پھیل رہا تھا۔ ہر چند لوگوں کی زبان پہ تالے پڑ چکے تھے جان کے خوف سے کوئی شخص امویوں کے سامنے کلمہ حق نہیں کہہ سکتا تھا مگر پھر بھی اس وقت عرب میں کہیں کہیں تھوڑا بہت آزادی کا شعور باقی تھا بعض بعض دیدہ دلیر لوگ متعجب ہو کر بسا اوقات سلطنت کے اراکین سے یہ سوال کر بیٹھتے کہ تم مسلمان ہو کر کیوں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پر کمربستہ ہو تم نے اپنی سلطنت کے لیے ہر طرف خون کی ندیاں بہا رکھی ہیں۔ کل خدا کو کیا جواب دو گے۔

کیا تمہیں خدا یاد نہیں، وہ جواب میں کہتے کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ انسان مجبور محض ہے۔ القدر خیرہ و شرہ۔ اس عقیدے کو جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو تو معلوم ہوگا کہ امویوں نے اپنے ظلم و ستم پر خاک ڈالنے کے لیے یہ عقیدہ قائم کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گروہ خوارج اور جبریہ کے بعد مسلمانوں میں ردعمل کے طور پر ایک تیسرا گروہ قدریہ کے

نام سے پیدا ہوا جس کے عقیدے کی بنیاد اس پر تھی کہ انسان سے بھلے بُرے جو بھی افعال سرزد ہوتے ہیں ان کا خالق خدا نہیں بلکہ خود انسان ہے۔

خواجہ حسن بصری شہر کی جامع مسجد میں قرآن و حدیث کا درس دیا کرتے تھے ایک روز آپ کے درس میں قدریہ فرقے کا ایک شخص معبد جہنی شریک ہوا جناب خواجہ سے اس نے مسئلہ جبر کا ذکر چھیڑا اور پوچھا کہ اموی اپنے اعمال کے جواب میں جو دلیل بری الذمہ ہونے کی پیش کرتے ہیں کیا آپ کے نزدیک درست ہے؟ خواجہ صاحب نے فرمایا کذب اعداء اللہ یعنی اللہ کے دشمن اموی جھوٹے ہیں مگر معبد جہنی جناب خواجہ کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے چند ایک بے تکے، بے معنی سوال اور کر دیئے۔ اس پر آپ نے بیزار ہو کر معبد جہنی سے کہا اعتزل منی۔ جا مجھ سے دور ہو جا کہتے ہیں اس دا تعہ سے گروہ قدریہ عوام میں فرقہ معتزلہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

بعضوں نے یوں لکھا ہے کہ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا یہ دونوں جناب خواجہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ یہ ایک روز معمول کے مطابق آپ کے درس میں شریک تھے کہ اسی اثنا میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں خوارج کے اس عقیدے کا بڑا چرچا تھا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے" اس شخص نے آتے ہی سوال کیا اور پوچھا کہ خوارج کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ایک گروہ ایسا بھی آگیا ہے جس کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان کسی نقصان سے ایسے ہی محفوظ ہے جیسے کفر کی حالت میں کوئی آدمی چاہے کتنی ہی نیکی کرے وہ اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیا یہ عقیدہ درست ہے؟ خواجہ یہ سوال سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ ابھی منہ سے کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ واصل چلّایا اور کہنے لگا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے نہ مومن بلکہ درمیانی منزل کا آدمی ہے۔ اور اس کے بعد وہ اور عبید دونوں آپ کے درس سے نکل کر چلے گئے۔ اس پر جناب خواجہ نے خفا ہو کر فرمایا اعتزل عنا۔ یعنی وہ ہمارے حلقے سے دور ہو گیا۔ کہتے ہیں اسی دن سے ان لوگوں کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

بہر کیف واقعہ خواہ کچھ بھی ہو اس پر تو تمام سیرت نگار اور مورخین نے اتفاق کیا ہے کہ معتزلہ ایسے رسوائے زمانہ لقب کی ابتدا جناب خواجہ حسن بصری ہی کی زبان مبارک سے ہوئی۔ لیکن ایک

معتزلہ کیا جناب خواجہ کا سلوک مسلمانوں کے کسی گروہ سے بھی ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج ہم اپنے عقیدے کے خلاف کسی کو پاکر ایک دوسرے سے شدید تعصب اور عداوت رکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا طرزِ عمل

اختلاف عقائد کے معاملے میں جناب خواجہ کا طرز عمل نہایت صلح کل تھا۔ یہی سبب ہے کہ بعد کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ خود انہی کے وقت میں بھی بعض لوگوں نے ان سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ معتزلہ کا گروہ جناب خواجہ حسن بصری ہی کو اپنے فاسد عقائد کا امام قرار دیتا تھا۔ اور یہ بھی طبقات ہی میں لکھا ہے کہ جناب خواجہ کو اسی سبب سے جناب معاذ کی حدیث پیش کرکے اپنے بارے میں اہل سنّت والجماعت ہی کے عقیدے کی توثیق وصیت کے طور پر پیش کرنی پڑی۔

علامہ سیرین

یہ حقیقت ہے کہ جناب خواجہ عقیدہ اور عمل کے اختلافی مسائل پہ باہمی عداوت اور دشمنی کی بنیاد رکھنے کو قطعاً روح اسلام کے خلاف سمجھتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں علامہ محمد بن سیرین جو آپ ہی کے ہم پلہ ہم عصر اور ہم شہر بزرگ تھے۔ جناب خواجہ حسن بصری کے صلح کل طرز عمل کی زندہ مثال ہیں۔

علامہ سیرین اور خواجہ صاحب کے درمیان عقیدے اور عمل کا اختلاف تھا مگر دونوں کی افتاد طبع مختلف تھی۔ خواجہ حسن بصری میں شان جلال تھی اور علامہ محمد سیرین میں شان جمال اگرچہ بصرے کے لوگ دونوں بزرگوں کے اختلاف سنتے تاہم دونوں ہی کو واجب الاحترام سمجھتے طرز عمل چونکہ جناب خواجہ کا کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر بصرے کے لوگ اختلاف کے قصے کو چکانے کے لیے اس طرح کہنے پہ مجبور ہو جاتے کہ خواجہ حسن بصری کے مزاج میں غصہ زیادہ ہے تقریر کے وقت چونکہ غیظ و غضب کا فطری طور پہ ان پہ غلبہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جن میں سخت گیری کا رنگ غالب ہوتا ہے مگر نیت دونوں بزرگوں کی نیک ہے۔ علامہ محمد بن سیرین اگر خاموش رہتے ہیں تو یہ اجر و ثواب

ہی کی غرض سے ایسا کرتے ہیں اور خواجہ حسن بصری جو کچھ فرماتے ہیں وہ بھی اجر و ثواب ہی کی نیت رکھتے ہیں۔

ثابت البنانی خواجہ صاحب کے شاگردوں کی تعداد یوں تو بے شمار ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ عالم و محدث جو مشہور ہوئے ہیں وہ جناب ثابت البنانی تھے ابن سعد نے لکھا ہے کہ علامہ سیرین اختلاف کی رو میں بہہ کر اکثر جناب خواجہ پر شدید چوٹیں کیا کرتے جناب ثابت البنانی سمجھتے تھے کہ جناب خواجہ کے دل پر علامہ محمد سیرین کے اس طرز عمل کا ضرور ایک گہرا اثر ہوگا۔

کہتے ہیں جس زمانے میں حجاج ثقفی اللہ والوں کے درپے آزار تھا اور مسلمانوں کی چیدہ چیدہ ممتاز شخصیتوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ جناب خواجہ لوگوں کے کہنے پر چند روز کے لیے کسی گوشہ تنہائی میں چھپ کے بیٹھ گئے اسی دوران میں جناب خواجہ کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ ثابت البنانی نے اس حادثہ کی آپ کو آکر خبر سنائی۔ ثابت البنانی۔ بصرے کے سب سے زیادہ عبادت گزار انسان تھے۔ کوئی مسجد ایسی نہیں تھی کہ جس کے سامنے سے گزر رہے ہوں اور اس میں دوگانہ ادا کیے بغیر چلے جائیں۔ پچاس برس میں کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں کی۔ ثابت خیال کرتے تھے کہ بچی کے جنازہ کی نماز پڑھانے کا مجھ ہی کو حکم دیا جائے گا۔ لیکن جب جناب خواجہ نے بچی کے کفن دفن کی تمام ہدایات دے کر آخر میں فرمایا کہ جب جنازے کو گھر سے باہر نکال کے لے آؤ تب محمد ابن سیرین سے کہنا کہ نماز آپ ہی پڑھائیں۔ ثابت البنانی کہتے ہیں کہ یہ جملہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں نے دیکھا کہ باوجود عقیدے کے شدید اختلافات کے خواجہ صاحب کے دل میں کوئی میل نہیں۔

بھلا ایسی شخصیت کہ جس کا طرز عمل اتنا پرکشش اور جاذب نظر ہو مخالفین اپنے عقائد اور نظریات کا موید یا امام ثابت کرنے کی کوشش میں کب کامیاب ہو سکتے تھے جن لوگوں نے جناب خواجہ کی ذات گرامی کو معتزلیوں سے وابستہ خیال کیا ہے ان کی نظر میں درحقیقت وہ حقائق

نہیں جن سے جناب خواجہ کی معتزلہ کے گروہ سے قطعی علیحدگی کی پر زور تائید ملتی ہے۔

فرقہ جبریہ

جبریوں کے مذہب کی بنیاد جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے اس عقیدے پر تھی کہ انسان مجبور محض ہے۔ بظاہر اس سے جو افعال منسوب کیے جاتے ہیں۔ بباطن ان سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے کہ انسان میں ارادے کی قوت ہے نہ اختیار کی اور نہ اس کے علاوہ کوئی اور قدرت اس میں ہے اسی طرح جبریوں کے نزدیک جزا و سزا کا تصور بھی جبر میں داخل ہے۔ جبری اپنے عقیدے کے زور کو قائم رکھنے کی اس طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ جیسے کوئی مر جائے تو اس کے بارے میں کہتے ہیں فلاں شخص مر گیا۔ حالانکہ اسے خدا نے مارا ہے یا جیسے یہ کہیں کہ فلاں پیدا ہوا۔ یا فلاں عمارت کھڑی ہو گئی حالانکہ اسے خدا نے پیدا کیا اور عمارت خدا ہی نے کھڑی کی ہے۔ حقیقت میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی عقیدہ فرقہ کی صورت میں زور پکڑ جائے پھر اگر اس کے بانی کی تلاش کی جائے تو وہ نہیں ملے گا کیونکہ بعد میں کسی فرقے کا نقطہ آغاز معلوم کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں زمانے میں ایک مذہب یا جماعت کی صورت اختیار کر گیا۔ پس اسی مفروضہ کے پیش نظر جبر کی تاریخ بیان کرنا تو مشکل ہے ہاں جبریوں کے بارے میں البتہ یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ امویوں کے دور حکومت کی یادگار ہے اور وہ ان کے زمانے میں بہت پھولا، پھلا۔

خواجہ حسن بصری نے جبریوں کے عقائد کو باطل کرنے اور ان کو سختی سے دبانے کی پوری پوری کوشش کیے چنانچہ احمد بن یحییٰ بن مرتضیٰ یمنی متوفی ۸۴۰ ہجری نے اپنی کتاب الملتبہ والامل میں جناب خواجہ کا ایک خط نقل کیا ہے جسے آپ نے بصرہ کے رہنے والوں کے نام لکھا تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔

"جو شخص خدا اور اس کے قضا و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے جو اپنے گناہوں کا بوجھ خدا پر ڈال دے۔ وہ بھی کافر ہے۔ خدا کی اطاعت مجبوری سے نہیں کی جاتی اور نہ کسی سے مغلوب ہو کر اس کی نافرمانی کی جاتی ہے اس لیے کہ مالک حقیقی نے مالک بنا دیا ہے اور جو قدرت انسان میں

پائی جاتی ہے۔ وہ اسی کی ودیعت کی ہوئی ہے۔ اگر وہ نیک اعمال انجام دیں تو ان کے افعال میں مداخلت نہیں کرتا۔ اور اگر معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ ان کے افعال میں مخل نہیں ہوتا اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہو جب وہ کچھ نہیں کرتے۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے انہیں چھوڑ دیا ہے اگر خدا مخلوقات کو اطاعت پر مجبور کر دیتا تو ثواب کو ساقط کر دیا ہوتا۔ اور اگر جبراً گناہوں پر مجبور کرتا تو سزا کو موقوف کر دیتا۔ اور اگر بے فائدہ چھوڑ دیتا تو اس کی عدم قدرت کی دلیل ہوتی بلکہ مخلوقات کے بارے میں اس کی خاص حیثیت ہے جسے اس نے ان سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ نیک کام کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اگر وہ معصیت کا شیوہ اختیار کریں تو اس کی حجت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔"

بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ عقیدہ جبر کی ابتدا تو جناب محمد رسول اللہ ہی کے زمانے سے ہوئی ہے لیکن اسے ایک مکمل مسلک یا مذہب کی حیثیت امویوں کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ بعضوں کا خیال یہ ہے کہ جبر کا عقیدہ خالص یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ بصرے میں اوّل اوّل جس شخص نے اس عقیدے کو پھیلایا وہ جہم بن صفوان تھا اور جہم نے اسے یہودیوں اور پارسیوں سے لیا تھا۔ اس لیے بنا بریں یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عقیدہ جبر عربوں کی افتاد طبع کا نتیجہ نہیں۔

ہمارے اس بیان پر بلاذری کی فتوح البلدان سے مکمل شہادت مل سکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اصل میں جبر کے عقیدے کا خود جہم بھی حقیقی بانی مبانی نہیں بلکہ اس نے اسے "الاسواریوں" سے لیا ہے جس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ شہنشاہ ایران کی فوجوں کا جرنیل یا سپہ سالار سیاہ نام ایک شخص تھا جو عوام میں سیاہ الاسواری کے نام سے مشہور تھا یزدجرد جب مدائن سے بھاگ کر اصفہان پہنچا تو اس نے اپنی بکھری ہوئی فوج کو اکٹھا کرنے کے لیے سیاہ اسواری کو بلایا اور اسے تین سو چیدہ سوار دے کر اصطخر کی حفاظت کے لیے روانہ کر دیا ابھی سیاہ اسواری اصطخر پہنچا ہی تھا کہ اتنے میں یزدگرد بھی اصطخر پہنچ گیا۔ اب یہاں سے اس نے سیاہ الاسواری کو جناب

موسیٰ اشعری کے مقابلہ میں سوس بھیج دیا۔ اسواری کے لوگ ابھی موسیٰ کے مقابلے میں پڑے ہوئے تھے کہ انہیں یزدگرد کے شکست کھانے اور بھاگ جانے کی اطلاع ملی اب اسواریوں نے طے کیا کہ ابوموسیٰ سے صلح کرلیں چنانچہ صلح ہوگئی۔

اس دوران میں یزدگرد کے اور بہت سے آدمی اصفہان سے چل کر سیاہ الاسوار سے آملے۔ ان لوگوں نے آکر یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے میں ہمارا جو حشر ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ہم جو بات سنتے آرہے تھے کہ اصطخر کے ایوان میں مسلمانوں کے گھوڑے لید کرینگے وہ بھی سب نے دیکھ لیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارا بادشاہ بھی ہمارے پاس نہیں رہا جانے کہاں فرار ہوگیا۔ اب ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے مسلمان بن جائیں اور اسلام قبول کرلیں۔

یہ بات اسواریوں کو معقول دکھائی دی چنانچہ وہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔ اسواریوں کا یہ گروہ ایران کو چھوڑ کر پھر ہمیشہ کے لیے بصرے میں آباد ہوگیا جن کے نام سے بصرے میں ایک خاص محلہ بھی قائم ہوا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے اپنے لیے ایک خاص نہر بھی کھودی تھی جس کا نام نہر الاساورہ تھا۔ کہتے ہیں انہی لوگوں میں ایک شخص ابویونس الاسواری بھی تھا۔ جس کا اسلام قبول کرنے سے پہلے نام سیسویہ یا سوسن تھا وہ خیالات جن کو بصرے میں پھیلانے کا پہلا گنہگار معبد جہنی تھا۔ وہ دراصل اسواریوں ہی کی افتاد طبع کا نتیجہ ہیں۔

جبری ہوں کہ قدری مختصراً یوں سمجھیے۔ کہ وصال نبوی کے بعد عراق۔ ایران و شام و دیگر ممالک کے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مسلمان ہونے کو تو مسلمان ہوگئے لیکن وہ اپنے ان قدیم نظریات سے دست بردار نہ ہوسکے جو نومسلموں کے ہاں متوارث تھے چنانچہ ان لوگوں میں اکثریت انہی کی تھی جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے باوجود قدیم عقائد کو ترک نہیں کیا اور صرف ترک ہی نہیں کیا بلکہ اسلام کو بھی انہی عقائد کی روشنی میں دیکھا۔ یہی سبب ہے کہ صحبت نبوی سے محرومیت کے سبب یہ لوگ اسلام میں طرح طرح کے فرقوں اور گروہوں کے بانی مبانی ہوئے۔

خواجہ حسن بصری نے قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کے ابطال کی کوشش فرمائی۔ آپ نے سُنت والجماعت کا یہ عقیدہ پیش کیا کہ انسان مجبور محض ہے نہ مختار کل بلکہ اس کے بین بین ہے آپ نے اس عقیدے کا اتنی شد و مد کے ساتھ اظہار کیا کہ حجاج ایسے ظالم حاکم کو اپنی حکومت کے بچانے کی فکر پڑ گئی۔ یہی سبب ہے کہ اس نے جبریوں کے مخالفوں کو چن چن کے قتل کیا غالباً جناب خواجہ کے قتل کا ارادہ بھی ہو گا کہ آپ روپوش ہو گئے۔ مگر خواجہ سے یہ عزلت گزینی کچھ زیادہ نبھ نہیں سکی کہ گوشہ تنہائی سے نکل آئے سان کی گفتگو ہوئی آخر میں اس نے چھوڑ دیا۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر تابعی کو جب حجاج نے انتہائی بے دردی کے ساتھ شہید کیا ہے تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ ایک خاص قسم کے جنون میں گرفتار ہو گیا۔ سوتا تھا تو خواب میں بھی اسے جناب سعید ہی نظر آتے اور کہتے کہ او ظالم تو نے کس جرم میں قتل کیا ہے؟ آنکھ کھلتی تو اس وقت بھی جناب سعید کو اپنے سامنے کھڑا پاتا۔

اسی دوران میں حجاج کے پیٹ میں سرطانی پھوڑا نکل آیا جس کا زہر دن بدن جسم میں بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ پھر اسی مرض کے سبب وہ ایک اور بیماری میں مبتلا ہو گیا جس کا نام زمہریرہ ہے اس بیماری میں اس کو ایسی سردی محسوس ہوتی کہ دہکتے انگاروں کی ہزار انگیٹھیاں بھی اس کے بدن کے قریب لائی جائیں تو کم ہیں۔ اس کے جسم سے انگیٹھی کو اتنا قریب کر دیا جاتا کہ کھال جلنے لگتی مگر اس کی سردی کم نہ ہوتی تھی۔

طبیبوں نے جب تجویز کیا کہ پیٹ میں پھوڑا ہے تو جانچنے کیلئے روٹی کے ٹکڑے کو تاگے میں باندھ کر حجاج کو نگلوایا جب ٹکڑا نگلا گیا تب جھٹکا دے کر باہر کھینچ لیا گیا جو صرف کیڑوں سے بھرا تھا۔ آخر بیماری ناقابل علاج قرار پائی۔

حجاج نے خواجہ حسن بصری کو بلایا اور رونے لگا اور آپ کی خدمت میں گڑگڑا کر التجا کی کہ میرے لیے دعا فرمایئے جناب خواجہ نے فرمایا۔ حجاج دیکھ کر میں نہ کہتا تھا کہ اللہ والوں سے مر

اچھے۔ انہیں مت ستایا کر۔ مگر تو نے میری ایک نہ سنی اور کبھی میری نصیحت پر عمل نہ کیا اب تڑپتا مگر اب رونے سے کیا فائدہ؟ سعید کے ساتھ تو نے جو کچھ کیا یہ اصل میں اسی کا خمیازہ ہے حجاج نے کہا۔ خواجہ اب صحت کی دعا نہ فرمایئے بلکہ موت کی دعا کیجئے۔ تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے۔

تصوف لفظ صوفی کس سے بنا ہے اور کس سے نہیں؟ اس کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیال ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک صوفی کا لفظ اصل میں صفوی تھا جو کثرت استعمال سے صوفی بن گیا۔ الوالحسن قناد کہتے ہیں کہ صوفی کا لفظ صفا سے بنا ہے جس کا مطلب ان لوگوں سے ہے جنہیں قدرت نے پہلے ہی سے بشری کدورتوں اور غلاظتوں سے پاک صاف رکھا ہے۔ بعض کہتے ہیں نہیں! جو لوگ سادگی کی وجہ سے صوف کا لباس پہنتے تھے وہ صوفی کہلائے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اصحاب صفہ کی مناسبت سے صوفی کا لفظ عہد نبوت ہی سے وجود میں آگیا۔ صفہ کے معنی عربی میں چبوترے کے ہیں وہ لوگ جن کا کوئی درتھانہ گھر جو دن میں کہیں کام کاج کو نکلتے۔ ہاتھ پیر ہلاتے اور اپنے لیے حلال روزی کماتے پھر فارغ وقت میں رسول اللہ سے علم دین حاصل کرتے اور آرام کے وقت مسجد نبوی کے چبوترے پر چلے آتے یہیں رہتے سہتے اور اسی کو اپنا گھر، مسکن اور ارام گاہ سمجھتے تھے انہیں اصحاب صفہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

استعمال کب ہوا جیسا کہ صوفی کے اشتقاق سے متعلق اختلاف ہے اسی طرح اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ لفظ صوفی کب استعمال ہوا کسی کے نزدیک صوفی کا لفظ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صوفی کا لفظ محمد رسول اللہ کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کہتے ہیں کہ یہ لفظ جناب محمد رسول اللہ کی رحلت شریف کے بعد رائج ہوا شیخ اکبر کہتے ہیں اور اخبار مکہ میں لکھا ہے کہ صوفی کا لفظ خواجہ حسن بصری کے زمانے میں پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں وہ بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ صوفی کا لفظ خواجہ حسن بصری اور سفیان ثوری کے اقوال میں کئی مرتبہ آیا ہے۔

جو لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ صوفی کا لفظ اسلام سے پہلے بھی تھا وہ درحقیقت

تصوف کے مسلک کا رشتہ یونان سے جا ملاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف کا مذہب مسلمانوں نے اس وقت اختیار کیا جب یونانی زبان کا عربی میں ترجمہ آیا۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ صوفی کا لفظ یونانی کے لفظ سوف بمعنی حکمت کی محبت سے لیا گیا ہے۔ جناب فرید الدین عطار نے تذکرۃ اولیاء میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک صوفی کا لفظ بغداد کے لوگوں کی ایجاد ہے۔

علامہ ابوریحان البیرونی کتاب الہند میں لکھتے ہیں کہ صوفی کے معنی فلاسفر کے ہیں یونانی زبان میں سوف کے معنی فلسفہ کے ہیں یہی وجہ ہے کہ یونانی زبان میں فیلسوف کو فیلا سوفا کہتے ہیں۔ یعنی فلسفہ کا مشتاق۔ چونکہ اسلام میں ایک جماعت ایسی موجود تھی جس کا مسلک یونانی صوفیوں کے قریب قریب تھا۔ اس لیے اس کا نام صوفی پڑ گیا۔

علامہ بیرونی کا بیان بہت واضح ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تصوف کی تحریک کو غیر اسلامی تحریکوں سے مستعار خیال کرتے ہیں۔ وہ اصل میں التباس لفظی سے دھوکا کھا گئے۔ ورنہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے تصوف کے محرکات اور صوفیائے اسلام کے طور و اطوار غیر اسلامی تصوف کے محرکات اور ان کے صوفیوں کے طریقہ کار سے بالکل مختلف ہیں۔

پہلا صوفی جیسا کہ تصوف اور صوفی کے مسلک کے ماخذ اور استعمال کے بارے میں اختلاف ہے اسی طرح اس باب میں بھی اختلاف ہے کہ اوّل اوّل کسی بزرگ کو صوفی کا لقب دیا گیا۔ کوئی جناب ابو ہاشم المتوفی ۱۵۰ ہجری کو پہلا صوفی قرار دیتا ہے کسی کے خیال میں جابر بن حیان پہلے صوفی ہیں۔ بہرکیف یہ دونوں ہی بزرگ کوفہ کے ہیں اور دونوں دوسری صدی ہجری ہی میں گزرے ہیں۔

جو لوگ تصوف کے مسلک کو عہد رسالت ہی سے قائم ہونے کا خیال رکھتے ہیں ان کے نزدیک صوفی کا لفظ جناب رسالت مآب محمد رسول اللہ کی رحلت شریف کے دو سو برس بعد رائج ہوا اس کا سبب کیا ہے؟ اسے شیخ سعدیؒ شیرازی کے بزرگ استاد علامہ جوزی نے یوں نقل کیا ہے کہ عہد رسالت میں جن لوگوں نے ذات رسالت مآب سے فیض باطنی و ظاہری حاصل کیا۔ ان

کے لیے صحابی سے بڑھ کر اس وقت کوئی اور لفظ ممتاز یا معزز نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جو لوگ صحابہ سے فیض یاب ہوئے۔ ان کے لیے تابعی اور پھر تابعین سے جنہوں نے اکتساب کیا ان کے لیے تبع تابعین سے بڑھ کر کوئی لفظ موزوں نہ تھا۔ جب تبع تابعین کا زمانہ بھی گذر گیا صرف وہ لوگ باقی رہ گئے جنہوں نے تبع تابعین سے زانوئے تلمذ نہ کیا تھا۔ انکے لیے صوفی کا لفظ استعمال کیا گیا کیونکہ تبع تابعی کے بعد اگر کوئی لفظ موزوں ہو سکتا تھا تو وہ صرف صوفی کا لفظ ہے۔

تصوف کے بارے میں یہ بات قطعی طے شدہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے آخر میں اس نے ایک نمایاں اور ممتاز مسلک کی صورت پکڑلی اس دور کے ممتاز صوفیوں میں جناب سفیان ثوری۔ ابراہیم ادھم داود طائی، فضل بن عیاض اور عورتوں کے طبقے میں جنابہ رابعہ بصریہ کے اسمائے گرامی بہت مشہور ہیں۔ علمائے تصوف نے دوسری صدی ہجری کو صوفیائے قدیم کا دور قرار دیا ہے۔ علامہ جوزی نے لکھا ہے کہ قدیم صوفیا۔ قرآن حکیم، حدیث نبوی، فقہ اور تفسیر کے امام تھے وہ لوگوں کو علوم شرعی کی ترغیب دیتے۔ کتاب وسنت کی اتباع کرتے اور اس کی تاکید کرتے تھے۔

علامہ جوزی نے خواجہ حسن بصری کی بزرگی کو تسلیم کیا ہے اور انہیں قدیم صوفیا کے امام کی حیثیت دی ہے۔

علامہ شبلی نے خواجہ حسن بصری کی فضلیت علمی کے پیش نظر اس بات پر تعجب کیا ہے کہ جناب امام اعظم ابوحنیفہ نے آپ سے اکتساب علم نہیں کیا۔ حالانکہ ۱۱۱ھ میں جناب خواجہ زندہ تھے۔ جناب خواجہ کا سن رحلت کسی کے نزدیک ۱۱۱ھ ہے کوئی ۱۱۲ھ کہتا ہے کسی نے ۱۱۴ھ لکھا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ جناب خواجہ نے ۱۱۰ ہجری میں وفات پائی۔

اول تو یہ جناب شبلی نعمانی کے نزدیک آپ کی تاریخ انتقال ۱۱۱ھ ہے وہ صحیح نہیں دوم یہ کہ خواجہ صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ وعظ وتلقین اور درس تدریس کے سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں جناب امام اعظم کو جو حضرت خواجہ حسن بصری کے انتقال کے

وقت صرف تیس۳۰ برس کے تھے آپ سے ر انڈ ٹے تلمذ نہ کرنے کا کیونکہ موقع ملتا۔

وفات خواجہ حسن بصری نے ۱۱۰ ہجری میں انتقال کیا۔ بصرے سے دو تین کوس پر آپ کا مزار پر انوار مرجع خلائق ہے۔

خواجہ حسن بصری اپنے خیالات کے آئینہ میں

ابن جوزی نے صفوۃ الصفا میں آپ کے اقوال نقل کئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں

خواجہ صاحب نے فرمایا جو نام نہاد مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ سواد اعظم ہمارے ہی جیسا ہے اور کہتے ہیں کہ جہاں اللہ انہیں بخش دے گا وہاں ہمیں بھی معاف کر دے گا وہ سخت غلطی پر ہیں اس طرح سے وہ نیک کام کرنے میں سستی سے کام لیتے ہیں اور اس کے فضل و کرم سے محروم رہتے ہیں البتہ خدا کے بارے میں اپنے دل میں من مانی آرزوئیں ضرور پکارتے رہتے ہیں۔

درحقیقت وہ شخص سب سے بڑا فاجر و فاسق ہے جو چھوٹے بڑے سبھی گناہ کئے چلا جاتا ہے مگر کہتا جاتا ہے کہ کوئی خطرے کی بات نہیں وہ بخشنہار سب کے گناہ بخشنے والا ہے میرے لئے کوئی کھٹکا نہیں۔

ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر ابو ھبیرہ نے جب وہ بصرے کے دورے پر آیا تو آپ کو کسی ضرورت سے یاد کیا آپ جب گورنر سے مل کر واپس ہو رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ چند علماء دروازے پر کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ گورنر سے ملاقات ہو یہ دیکھکر آپ بے ساختہ ان پر ٹوٹ پڑے فرما رہے تھے "کیا تم ان گندوں اور خبیثوں کے پاس جانا چاہتے ہو۔ بھاگو یہاں سے خدا تمہاری جان کو تمہارے جسم سے علیحدہ کرے تم لوگوں نے اہل علم کو رسوا کر دیا خدا تمہیں رسوا کرے۔ خدا کی قسم اگر تم اس چیز سے جو ان امیروں کے پاس ہے، بے نیاز ہو جاتے تو جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کے یہ طالب ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ان کے پاس جو کچھ ہے اسی کو تم نے مطلوب بنا لیا اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس سے

وہ بے نیاز ہو گئے

میں نے صحابہ کو دیکھا ہے جن کی نظر میں دنیا اس سے بھی زیادہ بے وقعت تھی جتنی بے قدر و قیمت تمہاری نظر میں تمہارے پاؤں کے نیچے کی خاک ہے۔ میں نے ان بزرگوں کو بھی دیکھا ہے کہ جن کے گھر رات آئی اور آئی غذا کے سوا جو صرف انہی کے لیے کافی ہو ان کے پاس اور کچھ نہ ہوتا اس پہ بھی وہ کہتے کہ صرف میں ہی اسے کھاؤں نہیں یہ مناسب نہیں بلکہ یہ کروں گا کہ کچھ خود کھاؤں گا اور کچھ اللہ کی راہ میں دے دوں گا۔ حالانکہ اللہ کی راہ میں وہ جو کچھ دیتے تھے اس کے خود ہی زیادہ محتاج ہوتے تھے۔

خدا کی قسم جس آدمی نے صحابہ کرام کو دیکھا ہو۔ قرن اول کو پایا ہو اور پھر وہ تم لوگوں کے درمیان رہ گیا ہو کوئی صورت اس کی نہیں سوائے اس کے کہ صبح کو جب اٹھے تو مغموم اٹھے اور جب شام ہو تو اس وقت بھی مغموم رہے۔

موت دنیا کو رسوا کر رہی ہے۔ کسی دانشمند کے لیے یہاں مسرت کی گنجائش ہی اس نے کہاں چھوڑی ہے۔"

اے مسلمانو! قرآن حکیم کے بعد پھر کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی۔ تمہارے نبی کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ پس تمہیں چاہیے کہ دنیا کو بیچ کر آخرت خرید لو۔ دین و دنیا دونوں میں نفع پاؤ گے اور آخرت کو بیچ کر جو شخص دنیا کو مول لے گا اسے دنیا میں نقصان رہے گا اور آخرت میں بھی خسارہ

اے آدم کے بیٹے تجھ پر افسوس ہے۔ کیا تو اللہ سے جنگ کرنے کی اپنے اندر سکت رکھتا ہے۔ دیکھ جو شخص خدا کے حکموں سے منہ پھیرتا ہے وہ اللہ سے جنگ کرتا ہے۔

خواجہ صاحب پر آشوب زمانے کے بزرگ تھے۔ نت نئے نئے فتنے اور فرقے مسلمانوں میں آئے دن اٹھتے رہتے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر خواجہ صاحب کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ انہیں عمر بھر اسی بات کی جستجو تھی کہ کسی طرح مسلمان آپس میں اختلافات کو ختم کر کے ایک ہو جائیں اور نیک بن جائیں اسی لگن اور دھن میں وہ اپنا تن من سب کچھ بھلا چکے تھے۔ دن رات مسلمانوں کی ہدایت

و اصلاح میں لگے رہتے تھے خواجہ صاحب کے ایک شاگرد ابراہیم بن علیلی الیشکری کہتے ہیں کہ میں نے جناب خواجہ حسن بصری سے زیادہ مغموم آدمی نہیں دیکھا۔ جب ان پر نظر پڑتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی زندہ مصیبت میں گرفتار ہیں۔

اقوال

سعید بن جبیر تابعی نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ آپ مجھے چند نصیحتیں فرمائیں آپ نے فرمایا۔ تین چیزوں سے تمہیں روکتا ہوں۔ اوّل یہ کہ بادشاہوں سے میل جول نہ بڑھانا ان کی عنایات پر بھروسہ نہ کرنا۔ کیونکہ انہیں آنکھ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ دوم یہ کہ کسی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا چاہیئے تم اسے قرآن حکیم ہی کی تعلیم کیوں نہ دو۔ تیسرے یہ کہ دنیا کے کسی راگ رنگ میں نہ پڑنا۔ پس جس نے ان باتوں پر عمل کیا اس نے ہدایت کی راہ پائی۔ نیز آپ نے فرمایا

۱- بھیڑ آدمی کی آواز پر فوراً نقل وحرکت شروع کر دیتی ہے مگر افسوس آدمی خدا کے حکم پر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

۲- بدوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ورنہ تھوڑی بہت اچھائیاں جو ہیں وہ بھی ہاتھ سے چلی جائیں گی۔

۳- جس نے قناعت کی وہ دنیا سے بے نیاز ہوا۔ جس نے لوگوں سے علیحدگی کی اس نے سلامتی پائی۔ جس نے شہوت کو ترک کیا وہ آزاد ہو گیا۔ جس نے چند روز صبر اختیار کیا اس نے سعادت پائی۔

۴- ورع کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی بات کہے حق کہے۔ چاہیئے خوشی میں ہو یا غم و غصے میں۔ دوسرے جس چیز میں خدا کا غضب ہو اس سے اپنے تمام اعضا کو نگاہ میں رکھے خدا کا خوف ہر لمحہ دل میں رہے یہ باتیں ہزار سال کی نماز روزہ سے افضل ہیں۔

۵- دنیا میں کوئی سرکش گھوڑا تیرے نفس سے زیادہ سخت لگام دیتے کے قابل نہیں۔

۶- اگر تجھے یہ دیکھنا ہو کہ تیرے بعد دنیا کی حالت کیا ہو گی تو دوسروں کی موت سے عبرت پکڑو اور دیکھ کہ ان کے بعد دنیا کا کیا حال ہے؟

۷۔ جو شیخی میں آگیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی احمق نہیں۔

۸۔ جو شخص دوسروں کی برائیاں تیرے سامنے کرتا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ تیری برائیاں دوسروں کے سامنے نہ کرتا ہوگا۔

۹۔ میرے نزدیک برادران دین۔ بیوی بچوں سے زیادہ عزیز ہیں کیونکہ وہ دین کے یار ہیں اور بیوی بچے دنیا کے ساتھی۔

۱۰۔ میرا کلام سنو کیونکہ میرا علم تمہیں فائدہ پہنچائے گا اور میری بے علمی تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

۱۱۔ جس دل میں دنیا کی محبت ہے وہ زندہ نہیں مردہ ہے۔

۱۲۔ جو نماز حضور قلب سے نہیں وہ عذاب کا پیش خیمہ ہے۔

۱۳۔ تقوٰی اور پرہیزگاری دین کی بنیاد ہے۔ طمع اور لالچ اسے کھو دیتا ہے۔

۱۴۔ تم ڈرانے والے کی صحبت اختیار کرو تاکہ کل قیامت میں رحمت الٰہی تمہارے قریب ہو۔

۱۵۔ میں لوگوں سے اس بات کی امید نہیں رکھتا کہ وہ مجھے برا نہ کہیں۔ برا کہنے والوں نے تو اللہ کو بھی برا کہا ہے۔

۱۶۔ انسان دوسروں کو نصیحت اس وقت کرے جب خود پاک ہو جائے۔

۱۷۔ قناعت کرنے والا خلق سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

۱۸۔ جس نے تنہائی اختیار کی اس نے سلامتی پائی۔

۱۹۔ جس نے حسد کو چھوڑا۔ اس نے دوستی پائی۔

۲۰۔ جس نے صبر اختیار کیا اس نے برخورداری حاصل کی۔

۲۱۔ صبر دو طرح پر ہے ایک مصیبت و بلا پہ دوسرے ان باتوں پر کہ جن کے نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

۲۲۔ جو خاموشی اختیار کرتا ہے اس کا دل ناطق ہو جاتا ہے اور زبان پر اثر ہو جاتی ہے۔

تصوف کے سلسلے

تصوف کا نام پانے سے پہلے تمام عابدوں اور زاہدوں کو ارباب حدیث کہا جاتا تھا۔ جب لوگوں کو دین کے مسائل پیش آنے لگے اور انہوں نے اپنے مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے ارباب حدیث کی طرف رجوع کیا تو ارباب حدیث میں جن بزرگان دین نے قرآن حکیم، سنت نبوی اور صحابہ کرام کے طرز عمل کی روشنی میں ان کے مسائل کا حل تلاش کر کے پیش کیا انہیں مجتہد یا فقیہہ کہا گیا۔

مجتہدین یا فقہائے کرام ارباب حدیث سے کوئی الگ جماعت نہیں بلکہ انہی بزرگان دین میں سے ایک جماعت کے افراد ہیں جو مسائل کے استنباط کے لیے شرعی نصوص پر قیاسی نتائج حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ امام اعمش ارباب حدیث و فقہائے کے فرق کو اس طرح بیان کرتے ہیں یا معشر الفقہاء انتم الاطباء و نحن الصیادلہ۔ اے فقیہو تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں۔ ہمارا کام ہے اچھی اچھی دواؤں کا اکٹھا کرنا اور تمہارا کام ہے دوا کی جانچ پڑتال کرنا۔ مرض معلوم کرنا۔ پھر مریض کے مرض اور اس کے مزاج کے مطابق دوا تجویز کرنا۔

مقصد یہ کہ فقہا اور صوفیا علمائے اسلام دو الگ الگ یا ایک دوسرے سے متصادم گروہ نہیں تھے بلکہ جس طرح سے فقہا صاحبان کے چار فقہی مکتب خیال ہیں یعنی امام ابو حنیفہ نے حنفی مکتب فقہہ قائم کیا۔ امام شافعی نے شافعی۔ امام محمدؒ مالک نے مالکی اور امام احمد بن حنبل نے حنبلی گویا حنفی۔ مالکی۔ شافعی اور حنبلی فقہہ اہل سنت والجماعت کے چار مکتب حق ہیں۔ اسی طرح سے وہ ارباب حدیث جنہیں بعد میں صوفیا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علم تصوف کے مختلف طریقے رکھتے ہیں اور وہ سب کے سب اسی طرح مکاتیب راسخ العقیدہ ہیں کہ جس طرح فقہہ کے چاروں مسالک مذاھب حقہ ہیں

جناب خواجہ حسن بصری اس اعتبار سے تمام ارباب حدیث میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں یعنی آپ ایک طرف امام الحدیث تھے دوسری طرف بصرے کے سب سے بڑے فقیہہ بھی، آپ نے فقیہہ یا مجتہد کے لیے حسب ذیل شرطیں مقرر کی ہیں۔

اوّل یہ کہ فقیہہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے یعنی دنیا اس کے نزدیک مقصود بالذات نہ ہو۔ دوم۔ آخرت کے امور میں رغبت رکھے۔ سوم۔ دین میں کامل بصیرت حاصل ہو۔ چہارم طاعات پہ مداومت کرنے والا ہو۔ پنجم مسلمانوں کی بے آبروئی اور ان کی حق تلفی سے بچنے والا ہو۔ ششم اجتماعی مفاد اس کے سامنے رہے۔ یعنی انفرادی و شخصی مفاد پہ قومی و اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتا ہو۔ ہفتم یہ کہ مال و دولت کا اسے لالچ نہ ہو۔

صوفیوں کے بارے میں آپ نے فرمایا۔ جو شخص تواضع اور انکسار سے صوفیوں کا لباس پشمینہ اونی کپڑا پہنے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی آنکھ اور دل کے نور میں اضافہ کر دے گا اور جو شخص غرور و نمائش کے لیے پہنے گا اس کو سرکشوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دے گا۔

خواجہ صاحب سے تصوف کے جو سلسلے آگے چلے ان میں سے ایک سلسلے کو پنج چشت کہتے ہیں۔ دوسرے سلسلے کو نو قادر کہا جاتا ہے۔ پنج چشت حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **زیدیہ** یہ سلسلہ حضرت خواجہ حسن بصری کے مرید و خلیفہ اول عبدالواحد بن زید کے نام سے موسوم ہے زید نے ۱۷۷ ہجری میں وفات پائی۔

۲۔ **عیاضیہ** حضرت عبدالواحد بن زید کے خلیفہ اول جناب فضیل بن عیاض کے نام سے موسوم ہے۔ عیاض نے ۱۸۷ ہجری میں انتقال کیا

۳۔ **ادھمیہ** یہ سلسلہ جناب فضیل عیاض کے خلیفہ اول جناب ابراہیم ادھم سے چلا۔ ابراہیم ادھم نے بادشاہت کو لات مار کر فقیری اختیار کی۔ ۱۶۲ ہجری میں رحلت ہوئی۔

۴۔ **ہبیرۃ البصری** یہ سلسلہ جناب خواجہ حذیفہ مرعشی کے واسطے سے جناب ابراہیم ادھم تک پہنچتا ہے۔ ہبیرۃ البصری ۲۸۷ ھ میں فوت ہوئے

۵۔ **چشتیہ** یہ سلسلہ جناب خواجہ اسحاق چشتی کے نام سے موسوم ہے اور یہ خواجہ ممشاد علو دینوری کے واسطے سے ہبیرۃ البصری تک پہنچتا ہے۔ سلسلہ نو نادر کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

۱۔ **حبیبیہ** یہ سلسلہ جناب خواجہ حسن بصری کے مرید و خلیفہ جناب حبیب عجمی کے نام سے موسوم ہے۔ حبیب عجمی نے ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔

۲۔ **طیفوریہ** یہ سلسلہ جناب حبیب عجمی کے خلیفہ و مرید جناب طیفور شامی المعروف بایزید بسطامی کے نام سے موسوم ہے۔ بسطامی نے جناب امام جعفر صادق سے روحانی توجیہ حاصل کی اور امام علی موسیٰ رضا سے خرقہ خلافت پایا۔ آپ نے ۲۶۰ ہجری میں انتقال کیا۔

۳۔ **کرخیہ** یہ سلسلہ جناب معروف کرخی سے چلا جو حضرت خواجہ داؤد طائی کے واسطے سے جناب حبیب عجمی کے مرید تھے آپ نے ۲۰۰ ہجری میں وفات پائی۔

۴۔ **سقطیہ** یہ سلسلہ حضرت معروفؒ کرخی کے مرید و خلیفہ جناب سری سقطی کے نام سے موسوم ہے سری سقطی نے ۲۵۴ ہجری میں وفات پائی۔

۵۔ **جنیدیہ** یہ سلسلہ جناب شیخ سری سقطیؒ کے خلیفہ اول جناب جنید بغدادی سے قائم ہوا۔ جناب جنید بغدادی نے ۲۹۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔

۶۔ **گاذرونیہ** یہ سلسلہ جناب جنید بغدادی کے مرید و خلیفہ کے مرید کے مرید جناب ابو اسحاق گاذرونی کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی جنید بغدادی کے مرید خواجہ ممشاد علو دنیوری ان کے مرید و خلیفہ حسین ابو علی الاکاران کے مرید جناب ابو اسحاق گاذرونی تھے انہوں نے ــــ میں وفات پائی۔

۷۔ **طوسیہ** یہ سلسلہ جناب علاءالدین طوسی کے نام سے موسوم ہے۔ طوسی نے ۵۶۰ ہجری میں وفات پائی۔ آپ جناب وجیہہ الدین ابو حفص عمر وطر طوسی کے مرید خلیفہ تھے طرطوسی جناب خواجہ عبداللہ خفیف کے مرید تھے خفیف۔ خواجہ احمد دنیوری کے۔ احمد دنیوری خواجہ ممشاد علو دنیوری کے اور یہ جناب جنید بغدادی کے مرید و خلیفہ تھے۔

۸۔ **سہروردیہ** یہ سلسلہ جناب خواجہ ابو نجیب سہروردی کے نام سے موسوم ہے یہ چچازادہ

نو واسطوں سے جناب حبیب عجمی تک پہنچتا ہے۔ ابو نجیب جناب طرطوسی کے مرید و خلیفہ تھے آپ نے ۵۲۳ ہجری میں انتقال کیا۔

۹۔ فردوسیہ جناب ابو النجیب سہروردی کے خلیفہ و مرید جناب نجم الدین فردوسی کے نام سے مشہور ہے۔ آپ نے ۶۱۸ ہجری میں انتقال فرمایا۔

سلاسل تصوف پس معلوم ہوا کہ تصوف کے تمام سلسلے جو حضرت خواجہ حسن بصری سے شروع ہوئے آپ ہی کے واسطے سے جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام تک پہنچتے ہیں۔

ہفت گروہ بعضوں نے بیان کیا ہے کہ خانوادہ فقر جو حضرت علی کی ذات مبارک سے فیض یاب ہوئے سات ہیں۔ اوّل امام حسن۔ دوم امام حسین۔ سوم خواجہ حسن بصری۔ چہارم خواجہ کمیل بن زیاد۔ پنجم۔ خواجہ اویس قرنی۔ ششم۔ قاضی شریح۔ ہفتم۔ خواجہ عبداللہ علمبردار۔ پھر ان بزرگوں سے آگے چودہ خانوادے ہوئے۔ بعضوں نے جناب امام حسن اور جناب امام حسین کے بجائے سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کی ذات کو فقر کے ہفت گروہ میں شامل کیا ہے۔

چہار سلسلے پاک و ہند میں اس وقت جو سلسلے ملتے ہیں وہ صرف چار ہیں۔ ۱۔ چشتی۔ ۲۔ قادری۔ ۳۔ سہروردی۔ ۴۔ نقشبندی۔ تصوف کے ان چاروں سلسلوں کی حیثیت وہی ہے۔ جو فقہ کے چاروں مذاہب کی ہے۔

چشتی سلسلے نے پاک و ہند میں مقبولیت حاصل کی۔ نقشبندی اور قادری سلسلہ خراسان ماوراالنہر اور مکہ و مدینہ میں مقبول ہوا سہروردی سلسلہ زیادہ تر توران و کشمیر میں پھیلا۔

رابعہ بصری وجہ تسمیہ رابعہ کہتے ہیں چوتھی کو۔ آپ کے والد محترم جناب اسماعیل نہایت عابد و زاہد اور بڑے متقی و پرہیزگار بزرگ تھے جناب رابعہ سے پہلے آپ کے تین بیٹیاں تھیں ان کے بعد جب آپ کی ولادت ہوئی تو چار بیٹیاں ہو گئیں

چنانچہ آپ کے والد محترم نے اسی رعایت سے آپ کا نام رابعہ رکھا۔
رابعہ کا اسم گرامی اسلام کی ان پاکیزہ اور نیک خواتین میں شمار ہوتا ہے جن کی ابتدا سے لے کر آخر تک تمام زندگی فقر و غنا سے عبارت ہے۔
رابعہ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کی عملی تفسیر تھا۔ آپ کے والد محترم زمانے کی سختیاں سہتے فاقے کرتے اور نت نئے مصائب و آلام برداشت کرتے چلے جاتے مگر زبان سے کبھی شکایت نہ کرتے اور نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے تھے۔

ظاہر ہے ایسے صابر و شاکر باپ کی بیٹی جو فطرتاً عابدہ و زاہدہ بھی شروع ہی سے ہو آنے والے زمانے میں اپنے وقت کی صاحب عظمت اور خدا رسیدہ خاتون کیونکر نہ ہو گی۔
رابعہ کے والد ایک مفلوک الحال شخص تھے۔ عالم یہ تھا کہ جس رات آپ کی ولادت ہوئی کپڑا لتہ تو ایک طرف گھر میں اتنا بھی نہیں تھا کہ چراغ جلایا جا سکتا۔
رابعہ کی والدہ نے جناب اسماعیل سے کہا کہ جائیے فلاں پڑوسی کے ہاں سے تھوڑا سا تیل مانگ لائیے۔ یہ عہد کر چکے تھے کہ میں کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کروں گا ع
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر
کے مصداق خود کو دست سوال دراز کر کے دوسروں کی نگاہوں سے نہیں گرائیں گے مگر اب موقع کی نزاکت اور بیوی کے اصرار پر بادل نخواستہ ایک پڑوسی کے گھر پہنچے مگر پھر وہاں سے خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ بیوی نے پوچھا۔ کیوں کیا ہوا؟ بولے وہ دروازہ نہیں کھولتا۔
اسماعیل کو پڑوسی کی اس بے مہری اور اپنے سوال کے ہاں لے جانے کا بے حد قلق تھا۔ اسی عالم میں سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی خواب میں جناب محمد رسول اللہ کی زیارت ہوئی جب آنکھ کھلی تو جو کچھ خواب میں دیکھا اور یاد تھا اسے ایک پرچہ پر لکھ کر امیر بصرہ کے پاس بھیج دیا۔ امیر نے مضمون پڑھتے ہی حکم دیا کہ دس ہزار درہم فقیروں کو اس شکرانے میں دے دیئے

جائیں کہ جناب محمد رسول اللہ نے مجھے یاد فرمایا۔ اور چار سو دینار اس مرد کو دے آؤ اور اسے میرے پاس بلا لاؤ۔ پھر وہ فوراً ہی بولا نہیں نہیں یہ بے ادبی ہے جسے جناب محمد رسول اللہ کی زیارت نصیب ہو مجھے اس کی خدمت میں خود پہنچنا چاہیے چنانچہ امیر بصرہ اسمعیل کے گھر پہنچا۔ ملاقات کی چلتے ہوئے یہ پیش کش کردی کہ آپ کو جس شے کی ضرورت پڑے مجھے اطلاع کروا دیا کیجیے۔

قدرت خدا کہ جب رابعہ ذرا سیانی ہوئیں تو ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب یہ زمانہ آپ کے امتحان و ابتلا کا شروع ہوا۔ ایک مرتبہ بصرے میں ایسا قحط عظیم پڑا کہ لوگ بچوں اور عورتوں کو اٹھا اٹھا کر لے جانے اور بیچنے لگ گئے۔

رابعہ بصری کی تین بڑی بہنیں معلوم نہیں کیا ہوا۔ کہاں گئیں وہ اس قحط کی نذر ہو گئیں خود رابعہ کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بے رحم ڈاکو انہیں پکڑ کر لے گیا۔ چند روز اپنے پاس رکھا پھر آپ کو ایک اور آدمی کے ہاتھ بیچ دیا۔

یہ شخص بڑا سنگدل تھا۔ آپ سے اکثر بڑی محنت و مشقت کے کام لیتا تھا۔ اکثر بھوکا پیاسا رکھتا۔ آپ اس کی خدمت کرتیں۔ مصائب اٹھاتیں مگر منہ سے اُف تک نہ کرتی تھیں ایک مرتبہ آپ کسی کام کے لیے کہیں جا رہی تھیں کہ کوئی نامحرم سامنے آ گیا۔ آپ اسے دیکھ کر بے تحاشہ بھاگیں اور بھاگتے بھاگتے گر پڑیں اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ پروردگار کی بارگاہ میں کھڑی ہوئیں۔ رو رو کے عرض کیا خدایا۔ میں غریب و یتیم اور قیدی ہوں۔ اب ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لیکن مجھے اس کا غم نہیں۔ معلوم نہیں تو مجھ سے راضی بھی ہے کہ نہیں میں صرف تیری رضا چاہتی ہوں اور اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو مجھے کچھ فکر نہیں

ایک رات جناب رابعہ خدا کے حضور میں سربسجود تھیں۔ اتفاق سے مالک جاگ رہا تھا۔ اس نے کوئی آواز سنی۔ اس نے غور سے دیکھا تو رابعہ سجدے میں رو رو کے عرض کر رہی تھیں خداوندا تو جانتا ہے کہ میرے دل کی خواہش تیرے احکام بجا لانے کی ہے اور آنکھوں کی روشنی تیری درگاہ کی خدمت میں ہے۔ اگر میں خود مختار ہوتی تو ہر وقت تیری عبادت

کرتی لیکن تو نے مجھے چونکہ اپنی مخلوق کا ماتحت بنایا ہے اس لیے تیری بارگاہ میں دیر سے حاضر ہوتی ہوں۔

مالک نے رابعہ کے یہ کلمات سنے تو ان کی تاثیر سے اس کا مردہ ضمیر جاگ اٹھا۔ شعور بیدار ہوا صبح ہوئی تو یہ دست بستہ اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور بصد ادب عرض کیا کہ آپ میری طرف سے آزاد ہیں یہاں رہیں تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں جانا چاہیں تو آپ کو اختیار ہے۔

مکہ و مدینہ کے بعد بصرہ و کوفہ (کہ جناب عمر فاروق کے حکم سے آباد کیے گئے) اسلامی علوم کے دو بڑے مرکز تھے۔ ہر چند بصرے میں آپ نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں طرح طرح کے مصائب و آلام برداشت کیے تاہم آپ کو بصرے کے در و دیوار سے ایک انس تھا۔ ایک وابستگی تھی۔ آزادی پانے کے بعد اب آپ کی علمی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ نے علمائے اسلام سے تھوڑی ہی مدت میں قرآن حکیم اور فقہ و حدیث وغیرہ ہم اسلامی علوم سیکھ لیے۔ اور ان میں یہاں تک مہارت پیدا کی کہ بڑے بڑے علماء پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

امام سفیان ثوری۔ امام مالک بن دینار اور بلخی ایسے خدا پرست عالم باعمل اور عابد و زاہد بزرگ آپ کے ہم نشینوں میں شامل تھے۔ اور اکثر مسائل میں آپ سے مشورے کیا کرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ جو مقام آپ نے علمی اعتبار سے پیدا کیا وہی مقام زہد و اطاعت میں حاصل کیا۔ اکثر ساری ساری رات عبادت و مناجات میں گزار دیتیں۔ امام سفیان ثوری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میں رابعہ بصری کے ہاں مہمان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ عبادت کے لیے شام سے مصلے پر کھڑی ہوئیں اور صبح کر دی ایک گوشہ میں علیحدہ ہو کر میں نے صبح کی نماز ادا کی۔ اولیائے کرام کی سیرت کتابوں میں لکھا ہے کہ

جناب رابعہ بصریہ نے جناب خواجہ حسن بصری کی مجلسوں کو سنا ہے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رابعہ کے تجرد اختیار کرنے کا سبب جناب خواجہ کے مسلک کی پیروی کے غلبہ کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔

البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ دنیا سے بے پروائی یقیناً جناب خواجہ کی صحبت سے پائی ہوگی رالبعہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز تھی۔ خدا کے حضور میں ہمہ وقت حاضر رہنے اور خیال عصیاں پہ دن رات آنسو بہانے کے سوا اسے کوئی دوسرا کام نہ تھا۔

فریدالدین عطار نے ایک امیر کا واقع لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب خواجہ حسن بصری۔ رابعہ بصری کی زیارت کے لیے آئے۔ انہوں نے دیکھا ایک امیر کبیر شخص نہایت افسردہ و آزردہ کھڑا ہے۔ خواجہ نے ماجرا پوچھا تو وہ کہنے لگا۔ میں دیناروں کی ایک تھیلی نذر کے لیے لایا ہوں مگر جناب رالبعہ نے قبول فرمانے سے انکار کر دیا ہو سکے تو آپ ہی میری سفارش کر دیجیے۔ خواجہ اندر گئے اور اس کا پیغام پہنچایا۔ رالبعہ نے روتے ہوئے کہا۔ پروردگار جانتا ہے کہ میں اس سے دنیا مانگتے عار محسوس کرتی ہوں حالانکہ وہ تمام دنیا کا مالک ہے، بھلا ایسے شخص سے کیونکر لے لوں جو اس کا مالک نہیں ہے۔

یہ حکایت تو اپنی جگہ قطعی درست ہے لیکن یہ واقعہ خواجہ کا نہیں ہے خیال کیجیے کہ جناب رالبعہ کی ولادت ۹۵ ہجری میں یا ۹۹ ہجری میں ہوئی ہے اور وفات ۱۸۰ ہجری یا ۱۸۵ میں پائی جناب خواجہ کا انتقال ۱۱۰ ہجری میں ہوا ہے اس وقت جناب رالبعہ کی کیا عمر ہوگی؟ کب قحط پڑا۔ مصائب میں گرفتار ہوئیں۔ اس کے بعد رہائی پائی اور طبیعت میں ایک زبردست انقلاب آیا یعنی دنیا کو ٹھکرانے اور دل سے بیزار ہو جانے کا جذبہ پیدا ہوا یہ تمام واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ جس وقت امیر بصرہ دیناروں کی تھیلی لے کر حاضر ہوا ہے۔ اس وقت جناب خواجہ اس دنیا سے بہت پہلے جا چکے تھے اصل میں یہ واقعہ امام سفیان ثوری کا ہے۔ وہی اکثر و بیشتر آپ کے پاس آتے جاتے تھے۔ اور وہی اس موقع پہ جناب رالبعہ کی زیارت کو آئے تھے۔

رالبعہ بصریہ کے سن ولادت کے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف ہے کسی نے ۹۹ ہجری لکھا ہے کسی نے ۹۵ ہجری بیان کیا ہے اسی طرح وفات کے متعلق بھی مختلف خیال ہیں کوئی کہتا ہے ۱۶۰ھ میں انتقال کیا کسی نے لکھا ہے ۱۸۰ھ ہجری میں فی اجل کو لبیک کہا۔ کسی کے نزدیک ۱۸۵ھ میں رحلت

فرمائی۔

خواجہ حسن بصری کے واقعات میں خواجہ فریدالدین عطار نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ جب تک رابعہ ایسی ایک ضعیف عورت نہیں آتی اس وقت تک آپ وعظ نہیں کہتے۔ اس کا سبب ؟ آپ نے فرمایا ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کو کیسے مل سکتی ہے۔

یہاں سوال اس سے نہیں کہ آپ نے کیا جواب دیا اور لوگوں نے آپ سے کیا پوچھا بلکہ کہنا یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا ولادتِ رابعہ کی تاریخیں درست تسلیم کر لی جائیں تو خواجہ صاحب کہ جن کا انتقال ۱۱۰ ھ میں ہوا ہے۔ یا مان لیا جائے کہ ۱۱۱ ، یا ۱۱۲ یا ۱۱۴ ھ میں وفات پائی۔ خواجہ کی رحلت کے وقت رابعہ کی کیا عمر ہو گی ؟ خیال تو یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی خواجہ حسن بصری کے زمانے کا نہیں بلکہ امام سفیان ثوری کے وقت کا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب امام سفیان ثوری کے بھی مختصر احالات بیان کر دیں جن سے اندازہ ہو سکے کہ آپ کس مرتبہ کے بزرگ تھے۔

امام سفیان ثوری

نام ۔ سفیان ۔ کنیت ۔ ابو عبد اللہ ۔ ۷۵ ہجری ۔ کوفے میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم کا نام سعید تھا ۔ وہ ثور بن مناۃ کی اولاد سے تھے اسی لیے آپ سفیان ثوری کے نام سے مشہور رہیں۔

حافظ ابن حجر اور خطیب بغدادی نے آپ کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں آپ کا مختصر اتعارف یہ ہے کہ آپ ائمہ فقہ وارباب حدیث میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں علم وفضل اور زہد واتقا میں آپ ضرب المثل تھے۔ آپ کے بارے میں تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ان کی طرف بڑھی مگر آپ نے دنیا سے نظر پھیر لی۔"

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ آپ جناب امام اعظم ابو حنیفہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ لیکن یہ بیان درست نہیں جناب ابو حنیفہ ۸۰ ھ میں پیدا ہوئے اس حال میں کوئی کیونکر دارا شکوہ کا بیان صحیح تسلیم کر سکتا ہے۔

جناب امام اعظم کے نزدیک سفیان ثوری کا بڑا بلند مرتبہ تھا ایک مرتبہ کسی شخص نے امام اعظم سے کہا آپ نے سنا نہیں کہ سفیان ثوری نے کیا روایت کی ہے؟ امام نے فرمایا کیا تم یہ کہنا چاہیئے ہو کہ سفیان حدیث کی تلاوت میں غلطی کرتے ہیں بخدا وہ ابراہیم نخعی (امام اعظم کے استاد) کے زمانے میں بھی ہوتے۔ تو تبھی لوگ حدیث میں ان کے محتاج ہوتے۔

واقعہ یہ ہے کہ امام سفیان ثوری۔ امام اوزاعی۔ امام مالک ان کے علاوہ خواجہ حسن البصری کے اکثر تلامذہ جناب امام اعظم کے معاصرین میں سے ہیں جناب سفیان ثوری کو ہم عصر ہونے کے علاوہ اس بات کا بھی فخر حاصل ہے کہ امام اعظم کے اکثر شاگردوں نے آپ سے حدیث پڑھی ہے۔ مثلاً۔

امام محمد بن حسن کہ امام اعظم کے شاگرد ہیں جناب سفیان ثوری سے بھی پڑھتے رہے ہیں۔ اور ایک امام محمد کیا اور بھی بہت سے ہیں جنہوں نے آپ سے پڑھا۔ سیرت نگاروں نے جابجا اس کا ذکر کیا ہے۔ اصل میں جناب امام سفیان ثوری کے استاد مشہور تابعی جناب ہشام بن عروہ ہیں۔ امام سفیان ثوری کے علاوہ۔ امام مالک اور سفیان ابن عیینہ بھی انہی کے شاگرد ہیں۔
جناب ہشام بن عروہ کے علاوہ امام سفیان ثوری نے سلیمان بن مہران معروف بہ اعمش سے بھی استفادہ کیا ہے جناب اعمش نے انس بن مالک صحابی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے اور عبداللہ بن ادنیٰ سے انہوں نے حدیث سنی ہے۔

جناب اعمش سے امام سفیان ثوری کے علاوہ جناب امام شعبہ نے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ یہ شعبہ وہی بزرگ ہیں جن سے امام اعظم جناب ابو حنیفہ نے فتوے اور روایت کی اجازت حاصل کی۔ انہوں نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ سفیان ثوری نے آپ کو امام الحدیث تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کے انتقال پہ کہا تو آج شعبہ پہ فن حدیث ختم ہوا۔ معلوم نہیں امام اعظم کو استاد دارالشکوہ نے کس بنیاد پہ لکھا ہے۔

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جناب سفیان ثوری کے مزاج میں دنیا اور دنیا والوں سے

بے انتہا بے نیازی تھی۔ جس زمانے میں منصور عباسی نے امام اعظم کو بغداد کا قاضی مقرر کرنا چاہا انہی دنوں اس کی نگہ انتخاب میں آپ بھی آگئے تھے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے ساتھ آپ کو بھی دربار میں طلب کیا گیا۔

امام سفیان ثوری کے بارے میں امام الحدیث سفیان بن عینیہ کا قول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان سے بڑھ کر کوئی شخص علم و تقوے میں نہیں دیکھا۔ چنانچہ امام خود بھی فرماتے ہیں کہ میں نے مسلسل تیس برس راتیں جاگ کر علم کے حصول کیلئے کوشش کی ہے۔ آنحضرت صلعم کی جو حدیث مجھ تک پہنچی ہے میں نے اس پر عمل کیا ہے اور ایسی ایک بھی حدیث نہیں جسے میں نے سنا ہو اور اس پر عمل نہ کیا ہو۔

سفیان ثوری کو اگر ان کی سیرت کے آئینہ میں دیکھا جائے تو آپ مجسم علم نظر آئیں گے اور علم بھی وہ کہ جس کا دوسرا نام صرف عمل ہے۔

امام سفیان ثوری بڑے درویش صفت عالم اور تصوف کے سلسلے کے بہت اونچے بزرگ تھے۔ انہیں اللہ پہ توکل تھا فقر و غنا کی دولت حاصل تھی ان کی زندگی کی یہ سب سے بڑی خصوصیت تھی کہ انہوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ لوگ اکثر تحفے تحائف لے کر ان کی خدمت میں پہنچتے اور آپ نہایت بے پروائی کے ساتھ واپس کر دیتے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے اس بات کا یقین کامل ہو جائے کہ اس دنیا میں کوئی شخص کسی آدمی کا محتاج نہیں تو میں ضرور لوگوں کے تحفے قبول کر لوں اور جو کچھ وہ لاتے ہیں وہ لے لوں یا ان سے کوئی شے طلب کر دں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ ہو یا فقیر امیر ہو یا غریب ہر شخص ایک دوسرے کا محتاج ہے اور ہر آدمی ضرورتمند ہے کوئی شخص کسی کا حاجت روا نہیں تو پھر میں کیوں کسی سے کچھ مانگوں اور طلب کر کے اس احسان اٹھاؤں میں کیوں نہ اس کی بارگاہ سے مانگوں اور سوال کروں جو کبھی کسی کے سوال کو رد نہیں کرتا اور کبھی اپنی نعمتیں عطا کرتے کرتے نہیں تھکتا۔

کہتے ہیں ایک نوجوان حج کو چلا۔ لیکن راستے میں کسی مجبوری نے اسے روک لیا۔ اسے حج کی سعادت سے محروم ہو جانے کا بڑا قلق تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ جناب سفیان ثوری اس کے پاس کھڑے تھے آپ نے اس نوجوان سے فرمایا میں نے چار حج کیے ہیں۔ جاؤ۔ ان کا ثواب تجھے بخشا۔ لیکن ایک آہ جو تو نے بھری ہے۔ وہ مجھے دے دے۔

آپ فرماتے ہیں کہ صرف ٹاٹ کے کپڑے پہننے اور جو کی روٹی کھانے کا نام فقر نہیں اور نہ اسے زہد و عبادت ہی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ فقر نام ہے دنیا میں رہ کر دنیا سے دور رہنے کا ممکن ہے بعضوں کو غلط فہمی ہو کہ جناب سفیان ثوری رہبانیت یا دنیا سے ترک تعلق کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ نہیں ان کا مطلب صرف یہ ہے بقول شاعر۔

بہ گیر رسم تعلق دلا ز مرغابی
کہ او ز آب چو برخاست خشک پر برخاست

یعنی انسان دنیا میں اس طرح سے رہے جیسے مرغابی پانی میں رہتی ہے کہ جب پانی سے باہر نکلتی ہے۔ پر خشک ہوتے ہیں۔

امام سفیان ثوری نے تمام عمر قرآن و حدیث کا درس دیا ہے جس شان کی کتاب موطا امام مالک نے لکھی اور سفیان عیینہ نے الجامع فی السنن والآداب لکھی قریب قریب اسی شان کی کتاب امام سفیان ثوری فی الجامع الکبیر فی الفقہ والاحادیث لکھی ہے۔

امام سفیان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ انسان جس حال میں بھی رہے خدا کا شکر ادا کرتا رہے اگر اس پر کوئی آفت بھی آ جائے تو خدا سے اس کا شکوہ نہ کرے اور نہ خدا کو کوئی الزام ہی دے۔

امام سفیان ثوری نے ۲ شعبان ۱۶۲ ہجری میں انتقال کیا اور بصرے میں مدفون ہوئے۔

آپ کے حالات زندگی میں جیسا کہ منصب قضا قبول کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ والوں کی نگاہ میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں۔

منصور نے منصب قضا تفویض کرنے کے لیے جن بزرگوں کے ساتھ سفیان ثوری کو بھی طلب کیا تھا اس سے ان کی گوشہ نشینی شہرت دناموری اور دنیا سے بے تعلق رہنے کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ ہر چند سفیان ثوری اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرنا چاہتے تھے مگر حکم حاکم مرگ مفاجات دربار میں حاضر ہوئے لیکن بجائے اس کے کہ منصور سے صریحاً انکار کر کے خدا واسطے کا بیر مول لیتے انہوں نے یہ کیا کہ وہاں پہنچ بہکی بہکی باتیں کرنا شروع کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوانہ خیال کیے گئے اور منصب کے قبول کرنے سے رہائی مل گئی۔

اس واقعہ سے یہ اندازہ نہ لگا لیجیے کہ آپ صاف بات کہنے کی اپنے اندر طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آپ کی دلیری و بے باکی تو یہ تھی کہ بڑے بڑے بادشاہوں کے سامنے کھری کھری اور بےلاگ باتیں کہنے سے کبھی نہیں جھجکے۔ بلکہ چاہتے یہ تھے کہ اس معاملے میں ایسی چال چلی جائے کہ جس سے بگاڑ بھی نہ ہو اور بات بھی بن جائے۔ ورنہ طبیعت کی جرأت کا عالم تو یہ تھا ایک مرتبہ مسجد حرام میں منصور سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے کہا قسم ہے آپ کو اللہ کے اس گھر کی۔ سچ سچ کہیے کہ آپ نے مجھے کیسا پایا؟ آپ نے فوراً بے دھڑک جواب دیا۔ قسم ہے مجھے اس گھر کے رب کی۔ میں نے تجھے بدترین آدمی پایا۔

ایک مرتبہ حج کے دنوں خلیفہ مہدی سے ملاقات ہوئی جب لوگ اس کی تعریف اور توصیف میں لگے ہوئے تھے اور اس کی خوبیاں ہو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا اے خلیفہ عمر ابن خطاب نے حج کیا تو صرف سترہ دینار خرچ کیے اور تو نے حج کیا ہے تو سارا بیت المال ہی خرچ کر ڈالا۔ کہتے ہیں مہدی یہ سن کر بہت خفا ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی جناب سفیان ثوری پہ دنیا تنگ ہو گئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنی جان بچانے کے لیے غریب الوطن ہونا پڑا اور غربت ہی میں آپ نے انتقال کیا۔

جناب سفیان ثوری کی آزادی و بے باکی کا اس واقعہ سے بھی ایک اندازہ کیا جا سکتا

ہے کہ جن دنوں شام میں کوئی حضرت علی کا نام تک نہیں لیتا تھا۔ یہ ان دنوں وہاں حضرت علی کے فضائل بیان کرتے اسی طرح عراق پہنچتے جہاں حضرت عثمان کا کوئی نام لینے والا نہیں تھا۔ تو یہاں حضرت عثمان کے مناقب کا ذکر کرتے اسی طرح کوفے میں حضرت ابوبکر صدیق اور بصرے میں جناب عمر فاروق کے محامد و مناقب بیان کرتے کہ یہاں کوئی صدیق و فاروق کا نام نہیں لیتا تھا۔

امام احمد بن حنبل نے جناب سفیان ثوری ہی کے شاگردوں سے تعلیم پائی ہے سفیان کی بیشتر حدیثوں کا حصہ انہیں ازبر تھا۔ اگرچہ انہیں سفیان کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم معنوی لحاظ سے جناب امام اگر انہیں اپنا استاد سمجھتے ہیں تو حق بجانب ہیں۔

ایک مرتبہ کسی نے امام احمد بن حنبل سے کسی نے دریافت کیا کہ امام کون ہیں؟ فرمایا۔ امام ایک ہی ہیں اور وہ ہیں سفیان ثوری خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ان کے درس کی سب سے پہلی مجلس خراسان میں قائم ہوئی اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ المختصر کہ جناب امام سفیان ثوری علم و عمل کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ کے بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ان کا مرتبہ علم و فضل کے لحاظ سے زیادہ بلند تھا۔ یا سیرت اور کردار کے لحاظ سے۔

جنید بغدادی

جُنید بغدادیؒ

ولادت بغداد میں پیدا ہوئے اور یہیں عمر بھر قیام کیا اسی رعایت سے بغدادی کہلائے جناب مخدوم علی ہجویریؒ نے آپ کا نام نامی واسم گرامی کشف المحجوب میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے: شیخ المشایخ اہل طریقت، امام الائمہ شریعت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ۔

جناب جنید کی کنیت ابوالقاسم۔ لقب سید الطائفہ۔ طاوس العلماء اور قواریری وزجاج ہے سیر نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کے والد محترم آبگینہ فروش تھے اسی رعایت سے آپ کو قواریری وزجاج کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

آپ جناب سفیان ثوری کے تلامذہ کے شاگرد اور اپنے ماموں جناب شیخ سری سقطیؒ کے مرید تھے۔ آپ کی عظمت کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کے ماموں سے دریافت کیا کہ کوئی مرید آپ کی نظر میں کیا ایسا بھی ہے جو مرتبہ ومقام میں اپنے مرشد سے بڑھ گیا ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں ہے۔ وہ جنید ہے۔

شیخ ابوجعفر حداد کہتے ہیں کہ اگر عقل بہ شکل انسان ہوتی تو جنید کی صورت میں آتی۔ آپ کے حکیمانہ وصوفیانہ اقوال اہل ایمان کے لیے تقویت کا باعث ہیں۔

جناب جنید بغدادی کے سن ولادت کے تعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ تیسری صدی ہجری میں اس وقت پیدا ہوئے کہ جب اسلامی علوم نقطہ عروج پہ تھے اور ماموں رشید کی مشاغل دینی وعلمی سے وابستگی کی بدولت بغداد میں بڑے بڑے باکمال علماء وفضلا جمع تھے۔

آپ ابھی سات ہی برس کے تھے کہ اپنے ماموں جناب شیخ سری سقطیؒ کے ساتھ حج کو گئے۔ جناب سری سقطی کے ساتھ ان کے بہت سے درویش بھی تھے۔ راستے میں ان سے دین کے مسائل پر بات چیت ہوتی آپ کے درویش باری باری اپنی معلومات اور عقل کے مطابق اظہار خیال کرتے ایک روز ان سے شکر کی تعریف پوچھی گئی۔ سب نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق جواب پیش کیا۔ مگر نکتہ کی بات کوئی نہ کہہ سکا۔ سری سقطی نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا بیٹا تم بتاؤ؟ آپ نے کہا۔ اللہ پاک کی نعمتوں کو پاکر اس کی نافرمانی نہ کرنا بس یہی شکر ہے۔

جناب جنید بغدادی کی تعلیم و تربیت آپ کے ماموں سری سقطی علیہ الرحمہ ہی کے التفات خصوصی کا نتیجہ ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ فقر و سلوک کے منازل طے کرنے کے ساتھ آپ ایک زبردست عالم دین اور فقیہہ بھی ہیں۔ چنانچہ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ بیس برس ہی کی عمر میں جناب ابو ثور کے حلقے میں بیٹھ کر فتوے لکھنے لگے۔

علوم دین میں تکمیل پاتے کے بعد آپ کے زہد و عبادت اور تسبیح و تقدیس کی طرف بہت زیادہ رغبت کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے کاروبار میں بھی مصروف رہے۔ شیشہ کی جو آبائی دکان آپ نے ورثے میں پائی تھی۔ اسی میں کاروبار شروع کر لیا اور شیشے کی بجائے ریشمی کپڑوں کے تھان رکھ لیے۔

مگر جس دنیا کے بارے میں جناب مولانا روم فرماتے ہیں کہ ع چیست دنیا از خدا غافل بدن اس سے آپ نے کبھی ایک لمحہ کا تعلق بھی پیدا نہیں کیا وہ ریاضت و مجاہدے بھی کرتے اور دنیا کے کاموں میں بھی مصروف رہتے لیکن ان تمام حدود شریعت کو سامنے رکھتے فرمایا کرتے کہ ہمارا یہ مذہب تصوف اصول کتاب و سنت کا مقید ہے جو شخص قرآن و حدیث اور کتاب و سنت سے واقف نہیں پیروی کے لائق نہیں۔

ایک وقت آیا کہ جناب شیخ سری سقطی نے اپنی آرزو کو پورا ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جناب جنید کو اتباع کتاب و سنت اور کمال اطاعت کی بدولت

روحانیت کے اتنے بڑے بلند مرتبے پر پہنچا دیا کہ خود جناب سری سقطیؒ ایسے کامل ترین بزرگ آپ سے رائے اور صلاح مشورے لینے لگے۔

ایک مرتبہ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے دیکھا کہ آپ کچھ پریشان سے ہیں۔ پوچھا، ماموں جان خیریت تو ہے۔ فرمایا ہاں خیریت ہے۔ آج ایک نوجوان میرے پاس آیا تھا۔ پوچھتا تھا کہ توبہ کی کیا تعریف ہے؟ آپ نے جواباً عرض کیا۔ توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں کو بالکل محو کر دے۔

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اول اول آپ وعظ کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔ مگر جب آپ کو خواب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو ان کے ارشاد پر آپ نے وعظ کہنا شروع کیا۔ اس عرصے میں آپ کے ماموں جناب شیخ سری انتقال کر چکے تھے۔

مگر جناب مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو جناب شیخ سری سقطی کی حیات ہی کے زمانے کا واقعہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے جناب جنید بغدادی سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شیریں و نکتہ آفریں زبان عطا فرمائی ہے آپ کا بیان درد وسوز سے پر ہوتا ہے۔ آپ وعظ فرمایا کیجیے۔ آپ نے کہا جب تک میرے شیخ و بزرگ ماموں زندہ ہیں ان کی زندگی میں وعظ کہنا میرے نزدیک خلاف ادب ہے۔

اسی دوران میں ایک روز جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کو زیارت نصیب ہوئی آپ نے فرمایا اے جنید، خدا کی مخلوق کو ضرور وعظ سنایا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے وعظ کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا ہے۔

جب آپ بیدار ہوئے تو دل میں خیال آیا کہ اب میرا مرتبہ شیخ سری سے بڑھ گیا ہے جبھی تو جناب محمد رسول اللہ نے مجھے وعظ کہنے کا حکم دیا ہے۔

جب صبح ہوئی تو آپ کے ماموں نے آپ کے پاس ایک درویش کے ذریعے پیغام بھیجا کہ اب تو جناب محمدؐ رسول اللہ نے بھی تمہیں حکم دیا ہے اس لیے اب اس کی تعمیل کرنا تم پر فرض ہے جناب جنید نے فرمایا کہ میرے دل میں جناب ماموں پر برتری پانے کا جو خیال

آیا تھا وہ یک لخت نکل گیا۔

جناب جنید فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے دل میں شیطان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی چنانچہ ایک روز مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی آتے ہوئے دکھائی دیا جب وہ میرے قریب آیا تو مجھے اس کو دیکھ کر سخت نفرت ہوئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں وہی ہوں جسے تم دیکھنا چاہتے تھے تب میں نے اس سے، اے گستاخ تجھے کس بات نے روکا کہ تو آدم کو سجدہ نہ کرے۔ وہ کہنے لگا اے جنید تم ایسے موحد کے دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا؟ کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کروں۔ مجھے اس کا جواب سن کر کوئی جواب نہ بن پڑا بہت حیران ہوا قریب تھا کہ میرا ایمان متزلزل ہو جائے مجھے غیب سے ندا آئی اے جنید اس سے کہہ دے کہ تو بالکل جھوٹا ہے اگر تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ اور اس کے اختیارات پر ایمان رکھتا تو کبھی حکم عدولی نہ کرتا پس شیطان نے میرے دل کی آواز سن لی اور میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

جناب جنید بغدادی کے مزاج میں حلم۔ تحمل اور بردباری قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھری تھی طبیعت میں سنجیدگی، متانت و شفقت آپ کا جوہر خاص تھا یہی سبب ہے کہ آپ علماء اور صوفیاء دونوں گروہوں میں نہایت معزز و محترم تھے ہر چند بعض شر پسند طبائع نے آپ سے حسد کیا اور آپ کو تکالیف پہنچانے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید ایزدی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی۔

آپ کے زہد و تقویٰ کو توڑنے کے لیے ایک مرتبہ شر پسندوں نے آپ کے پاس ایک نازنین، خوروش پری تمثال عورت کو بھیجا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور نہایت انکسار و عجز کے ساتھ گڑگڑا کر استدعا کی کہ آپ مجھے اپنی صحبت میں رکھ لیجیے اور اللہ اللہ کرنا سکھا دیجیے آپ اس کی باتوں کو سر جھکائے بغور سنتے رہے اور اس کے بعد اللہ کہہ کر ایک آہ جو کھینچی تو وہ تڑپ کر گری اور گرتے ہی دم نکل گیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی آہ اثر سے خالی نہیں جاتی اللہ اپنے بندوں کی ہر طریقے سے مدد کرتا ہے جو اللہ کے بندوں کو ستاتے ہیں اللہ جلد یا بدیر ضرور انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک عورت روتی پیٹتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ میرا بیٹا کہیں کھو گیا، دعا فرمایئے کہ وہ مل جائے۔ آپ نے فرمایا۔ جا بی بی جا صبر کر وہ عورت چلی گئی مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر حاضر ہوئی اور دعا کے لیے عرض کیا آپ نے اسے پھر یہی جواب دیا چنانچہ وہ چلی گئی۔ لیکن ماماتا کی ماری ایک لمحہ چین سے نہ بیٹھ سکی وہ تیسری مرتبہ پھر حاضر خدمت ہوئی اور عرض کیا کہ اب میرا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا۔ اب مجھ میں صبر کی طاقت نہیں رہی آپ دعا فرمائیں آپ نے فرمایا اے بی بی اگر یہی بات ہے تو جا گھر چلی جا سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تیرا بیٹا گھر آ گیا چنانچہ وہ عورت گھر چلی گئی اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا صحیح آگیا وہ فوراً اس کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

لوگوں نے اس واقعہ پر بڑا تعجب کیا۔ آپ نے جواب میں قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھی امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء۔ فرمایا کہ جب اس عورت میں ضبط کی طاقت نہ رہی تو کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اس کی نہ سنتا اور دعا قبول نہ کرتا۔

تصوف کا علمی دور

آپ کا زمانہ تیسری ہجری کا وہ علمی دور ہے جس میں تصوف نے ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت پائی۔ آپ ہی کے زمانے میں علم تصوف پر تالیفات و تصنیفات کا آغاز ہوا۔

تذکرۃ الاولیاء میں خواجہ فرید الدین عطار لکھتے ہیں کہ "کسے کہ علم اشارت منتشر کرد جنید بغدادی بود۔ یعنی جس شخص نے سب سے پہلے علم اشارہ کی اشاعت کی وہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ تھے۔

علم کے بارے میں بھی آپ ہی کے زمانے میں کہا گیا کہ علم کے دو پہلو ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی۔ ظاہری سے مراد شریعت اور باطنی سے مراد طریقت اسی زمانے میں یہ رائے بھی قائم کی گئی کہ باطنی علوم سب سے پہلے جناب محمد رسول اللہ سے جناب علی کرم اللہ وجہہ نے حاصل کیئے پھر ان سے جناب خواجہ حسن بصری نے پھر ان سے دیگر تمام بزرگانِ دین یکے بعد دیگرے سینہ بہ سینہ حاصل کرتے چلے آئے اسی مناسبت سے علم تصوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علم سفینہ نہیں بلکہ علم سینہ ہے۔

کہا گیا کہ شریعت سے انسان حقیقت کو پاتا ہے اور طریقت سے اسے معرفت حق حاصل ہوتی ہے۔ گویا شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت ہی وہ عناصر چہارگانہ ہیں جو قدیم صوفیائے کرام کے تصوف کو صوفیائے متاخرین سے علیحدہ کرتے ہیں یہی وہ پہلا مرحلہ ہے جہاں سے عالموں اور صوفیوں کے درمیان ایک مستقل نزاع شروع ہوا علمائے کرام اور صوفیا دو علیحدہ گروہ بن گئے سید الطائفہ جناب جنید بغدادی اس سلسلے کے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر کہ شریعت اور طریقت اسلام کی دو مختلف راہیں نہیں بلکہ ایک ہی تعلیم کے دو پہلو ہیں اس تنازع کو ختم کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

تصوف کے بارے میں آپ فرماتے ہیں۔ ہر برے اخلاق سے علیحدہ رہنا اور اچھے اخلاق اختیار کرنا تصوف ہے۔ تصوف کا علم کتاب و سنت سے باہر نہیں جس نے قرآن مجید نہیں پڑھا اور حدیث نہیں لکھی وہ تصوف میں بات کرنے کا اہل نہیں۔

اہل تصوف کا سب سے بڑا سرمایہ فقر ہے۔ فقر تمام تشکلوں سے دل کو خالی کر دینے کا نام ہے وہ اہل فقر سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ اے فقرا تم اللہ تعالیٰ کی معیت ہی سے پہچانے جاتے ہو۔ اور اسی سبب سے تمہاری عزت کی جاتی ہے۔ پس تم جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت میں ہوتے ہو تو غور کرو کہ تمہارا رشتہ اللہ تعالیٰ سے کتنا مضبوط اور کس قدر استوار ہے۔ صاحب کشف المحجوب اس عبارت کی تشریح فرماتے ہیں کہ جناب جنید بغدادی نے فرمایا اے درویشو خلق خدا تمہیں درویش

کہتی اور تمہارا حق ادا کرتی ہے تمہیں بھی غور کرنا چاہیے کہ تم درویشی کی راہ کے تقاضے کیونکر پورے کرتے ہو۔ اور اگر پورے نہیں کرتے اور خلق خدا تمہیں کسی دوسرے نام سے پکارے تو اس حال میں تمہیں بھی ناراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم بھی اپنے دعوے میں انصاف و راستبازی سے کام نہیں لے رہے وہ شخص جو اپنے دعوے کے خلاف چلے اس کی مثال اس طبیب جیسی ہے جو فن طبابت کے بلند بانگ دعوے کرکے بیماروں کو اپنے پاس بلاتا ہے لیکن فن طبابت سے بالکل ناواقف ہے اس طرح بیماروں کی بیماریاں گھٹنے کی بجائے بڑھتی ہیں یہاں تک کہ جب وہ خود بیمار پڑ جائے تو اپنا بھی علاج نہ کر سکے اور وہ دوسروں کے پاس جانے پر مجبور ہو۔

قدیم صوفیا کا دور جن بزرگان دین کے نام سے عبارت ہے ان میں سید الطائفہ جناب جنید بغدادی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ آپ کے علاوہ اس دور کے جن دوسرے بزرگوں نے بھی شہرت پائی ان میں جناب جنید بغدادی کے خلیفہ و مرید شیخ ابوبکر شبلی، شیخ ابو علی ثقفی، شیخ سہیل بن عبداللہ تستری ۔ شیخ علی رودباری شیخ ابوبکر طمستانی، بایزید بسطامی، ابوبکر شفاف، حسین نوری، سری سقطی، اسمٰعیل بن نجید، ابو عثمان حیری وغیرہ شیوخ عظام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اللہ اور اللہ کے رسول کی مکمل اطاعت و فرماں برداری کرنا ہر تدبیر پہلا کہ حق حلال کی روزی کمانا۔ بلا امتیاز و تخصیص تمام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔ ظاہر و باطن ایک ہونا۔ اور اعمال میں اخلاص کا پیدا کرنا صوفیائے قدیم کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مختصراً یہ کہ تابعین و تبع تابعین کے دور کو قدیم صوفیا کا دور کہا جاتا ہے اور اسی زمانے کے بزرگان دین علم شریعت میں کامل تبحر کے حامل تھے۔

مگر جن صوفیوں نے تصوف کے نام پہ اپنے آپ کو علم و عمل سے بیگانہ کر لیا درحقیقت انہوں نے اولیائے کرام کی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ تصوف کے بارے میں ابوبکر طمستانی کہتے ہیں راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے موجود ہے۔ بایزید بسطامی کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو دیکھو کہ اسے اتنی کرامتیں دی گئی ہیں کہ وہ ہوا میں اڑتا

ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ یہاں تک کہ دیکھ لو کہ وہ امر و نہی اور حدود شریعت میں کیسا ہے؛

ابوبکر شفاف کہتے ہیں جس نے ظاہر امر و نہی کے حدود کا لحاظ نہیں رکھا وہ دل کے مشاہدۂ باطنی سے محروم رہا۔

حسین نوری کہتے ہیں اگر ایک شخص کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اسے علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ۔ اور اگر ایک شخص کو دیکھو کہ وہ ایک ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں دیتی تو اس کے دین پر تہمت لگاؤ۔

سری سقطی کہتے ہیں ۔ جس شخص نے ایسی باطنی حقیقت کا دعویٰ کیا جس کی تردید شریعت کے ظاہری حکم سے ہوتی ہے اس نے غلطی کی۔

اسمٰعیل نجید کہتے ہیں ۔ امر و نہی پر صبر کرنا تصوف ہے۔

جناب جنید ۔ مرض الموت میں بھی تکیہ پر منہ رکھ کر نماز پڑھ رہے تھے کیونکہ ان کے منہ پر ورم تھا کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا ایسی حالت میں بھی نماز نہیں چھوڑی جا سکتی آپ نے فرمایا نماز ہی کے ذریعے سے خدا تک پہنچا ہوں اس لیے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا اور اس کے چند گھنٹے بعد آپ مالک حقیقی کے پاس چلے گئے۔ آپ نے دار الفنا سے دار البقا کی طرف ۲۹۸ھ میں کوچ کیا۔

وجد و سماع کی محفلوں کا رواج بھی آپ ہی کے زمانے میں شروع ہوا۔ لیکن آپ اور دوسرے تمام صوفیائے قدیم ان محفلوں سے کلی اجتناب کرتے رہے۔ محدث ابن جنیدی نے لکھا ہے کہ شروع شروع قوالی میں صرف زاہدانہ اشعار و قصائد تھے۔ متاخرین صوفیا کے دور میں عاشقانہ اشعار اور گانے کا رواج ہوا جناب جنید بغدادی فرماتے ہیں "کہ جب تم کسی مرید کو سماع میں مشغول دیکھو تو یقین کر لو کہ اس میں لہو و لعب کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ حسین نوری کہتے ہیں۔ کہ جب تم مرید کو دیکھو کہ وہ قصائد سن رہا ہے اور راحت طلبی کی طرف مائل ہے تب اس سے بھلائی کی توقع نہ رکھو"

فرید الدین عطار نے تذکرہ اولیاء میں لکھا ہے کہ اگرچہ تصوف کی عام اشاعت جناب

جنید بغدادی ہی سے ہوئی ہے لیکن ان کا لباس (پشمینہ) صوفیا کی بجائے عالموں کا تھا جناب مخدوم علی ہجویری کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جناب جنید بغدادی کے نزدیک تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے۔

اوّل سخاوت (جناب ابراہیم علیہ السلام کی) دوم رضا (جناب اسماعیل علیہ السلام کی) سوم صبر (جناب ایوب صابر علیہ السلام کا) چہارم اشارہ (جناب زکریا علیہ السلام کا) پنجم غربت (جناب یحیٰی علیہ السلام کی) ششم سیاحت (جناب عیسٰی علیہ السلام کی) ہفتم اون کا لباس (جناب موسٰی علیہ السلام کا) ہشتم فقر (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا) یعنی آٹھ خصلتیں جن سے ان پیغمبران اولوالعزم کی سنّت پوری ہوتی ہے تصوف کی بنیاد ہیں۔

شطحیات

ایسے الفاظ و کلمات جو بعض اوقات حدود شریعت سے متجاوز ہو جاتے ہیں تصوف کی اصلاح میں "شطحیات" کہلاتے ہیں۔ جناب جنید بغدادی کے زمانے میں "شطحیات" عام تھے مگر آپ نے ان کلمات کے ادا کرنے والوں کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لکھا ہے ایک مرتبہ آپ کی خانقاہ میں ایک فقیر کالی گدڑی پہنے ہوئے آیا۔ آپ نے اس کی ماتم داری و سیاہ پوشی کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا میرے خدا کی وفات ہو گئی اس پر آپ نے اسے تین مرتبہ خانقاہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا لیکن فقیر نے اس کی تعمیل نہ کی۔ چوتھی مرتبہ جب اس سے پھر کہا گیا تب اس نے اپنے کلام کی اس طرح توضیح و تشریح کر کے جناب جنید کے غیض و غضب سے رہائی پائی۔ کہا کہ میرا نفس مظہر خدا ہے میں نے اسے قتل کر دیا ہے (یعنی نفس کشی کی) اس لیے اب اس کا ماتم دار ہوں۔

منصور حلاج کے نعرہ انا الحق کا قصہ آپ کے زمانے کا سب سے زیادہ مشہور واقعہ ہے۔ مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ عین ممکن ہے کہ علامہ جوزی کی یہ رائے غلط نہیں کہ منصور نے سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی کی راہ اختیار کی اور بالآخر جناب جنید بغدادی ہی کو منصور کے قتل کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کرنی پڑی۔

منصور حلاج

حسین بن منصور حلاج، کے والد ایک نومسلم ایرانی تھے جو بیضا نام ایران کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ یہیں اس حسین کی ولادت ہوئی جس نے منصور حلاج کے نام سے شہرت پائی۔ منصور کے والد کسی وجہ سے جلد ہی بیضا سے نکل کر عراق میں آکر آباد ہو گئے جہاں منصور نے ہوش سنبھالا۔

خواجہ فریدالدین عطار نے منصور کو قتیل اللہ فی سبیل اللہ اور شیر بیشۂ تحقیق جیسے القاب سے یاد کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر تذکرہ اولیاء میں خود ہی تفصیل کی کہ بعض مشہور اولیائے کرام منصور کی بزرگی کو تسلیم نہیں کرتے۔

علامہ جوزی نے "تلبیس ابلیس" میں منصور کے خیالات و عقائد تفصیل سے بیان کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ منصور سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا انسان تھا۔ یا اس نے تشبیہ و استعارات کی پرپیچ وادیوں میں خود کو گم کر دیا تھا۔ علامہ جوزی نے منصور کے حالات تلبیس ابلیس میں تفصیل سے لکھیں ان کے نزدیک اس کے تحصیل علم کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب وہ سن بلوغت کو پہنچا عراق چھوڑ کر شوستر چلا گیا وہاں سہیل بن عبداللہ کی شاگردی اختیار کی اٹھارہ برس کی عمر تک ان کے پاس رہا۔
اس کے علاوہ اسے ابوالحسین نوری اور جنید بغدادی ایسے اولیائے کرام کی صحبت میسر آئی برسوں ان کی خدمت میں جاتا رہا۔ پھر بغداد سے بصرے چلا گیا اور عمر بن عثمان کی صحبت اختیار کی اب تک اس کے خیالات عام سیدھے سادے مسلمانوں کی طرح تھے۔ لیکن اب اس کے خیالات بدلنے لگے اور ذہن طرح طرح کی نئی تاویلات و تعبیرات کی طرف پھر گیا اس کا سبب ان کتابوں کا دیکھنا تھا جنہیں تصوف کے موضوع پر عمر بن عثمان نے لکھا تھا۔ اور پھر وہ اس حال کو پہنچ گیا کہ تصوف کی وہ باتیں جنہیں بڑے بڑے صوفیائے کرام بھی لب پر لانے کی ہمت نہ رکھتے یہ انہیں برملا کہنے لگا جس سے لوگ نہ صرف اس سے بیزار ہو گئے۔ بلکہ عمر بن عثمان سے بھی نفرت کرنے لگے۔

ایک روز منصور نے جناب جنید سے بھی وہی چند ایک الٹے سیدھے سوال کئے کہ جن

کے بارے میں عام لوگوں کو شکایت تھی جناب جنید نے فرمایا۔ وہ وقت قریب ہے کہ جب لکڑی کا ایک سرا تیرے خون سے لال ہوگا۔

منصور آپ کی تنبیہ کے بعد بغداد سے پھر شوستر آگیا۔ رنگ طبیعت میں کسی قدر تبدیلی آگئی اور مزاج میں ایک عالمانہ و فاضلانہ شان پیدا ہوگئی۔ لوگ عزت و احترام کرنے لگے لیکن اس حال میں ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ پھر وہی خیالات عود کر آئے اور اپنی پہلے والی باتوں پر پھر آگیا۔

وہ تصوف کے نام سے ایسی ایسی باتیں کہتا اور گل افشانیاں کرتا تھا کہ جاہل تو ایک طرف خود عالموں کے پلے نہیں پڑتی تھیں ان میں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے انا الحق (میں حق ہوں) کا نعرہ شروع کیا، وہ کہتا تھا ۔

ان من اھویٰ ومن اھویٰ انا۔ نحن روحین حللنا بدنا

فاذا ابصرتنی ابصرتہ۔ واذا ابصرتہ ابصرتنا

ترجمہ: میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جسے میں چاہتا ہوں وہ میں ہی ہوں۔ ہم دونوں روحیں ہیں جنہوں نے ایک قالب میں حلول کیا ہے اسی لیے جب تم مجھے دیکھتے ہو تو اسے دیکھتے ہو، جب اسے دیکھتے ہو تو ہمیں دیکھتے ہو۔

آخر لوگ علمائے اسلام کے پاس جا جا کر شکایتیں کرنے لگے علما نے صوفیائے کرام سے پوچھا کہ اس کا کیا علاج کرنا چاہیئے اگرچہ علماء و صوفیہ سب نے مل کر سمجھایا کہ یہ کلمات کفر ہیں ان سے زبان کو روک لے مگر اس نے کسی کی نہ مانی انجام کار یہ کہ سب کو منصور کے خلاف سزائے قتل کا فیصلہ کرنا پڑا۔

منصور کے خیالات سے لوگوں میں اس کے خلاف جو فضا پیدا ہوئی ذیل کے واقعات سے اس کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔

عمر مکی کہتے ہیں ایک مرتبہ حسین بن منصور مکہ کی ایک گلی میں جا رہے تھے اور میں ان کے ہمراہ

قرآن پڑھتا جا رہا تھا۔ میری قرأت سن کر بولے کہ ایسا کلام میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ یہ بات سنتے ہی میں ان سے علیحدہ ہو گیا۔

محمد بن یحییٰ رازی کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عثمان کو حلاج پر لعنت کرتے ہوئے سنا اور کہتے تھے کہ اگر میں نے حلاج پر قابو پایا تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا۔ میں نے پوچھا اس کا سبب؟ کہا۔ میں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی تو کہنے لگا ممکن ہے ایسا کلام میں بھی تالیف کر لوں۔

ابو بکر بن مشاد نے کہا کہ دینور میں ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس کے پاس ایک تھیلی تھی جسے وہ دن رات اپنے پاس رکھتا اور کبھی جدا نہ ہونے دیتا تھا۔ لوگوں نے اس کی تھیلی کو ٹٹولا تو اس میں حلاج کا ایک خط نکلا جس کا عنوان یہ تھا کہ رحمان رحیم کی طرف سے فلاں بن فلاں کو واضح ہو کہ" وہ خط بغداد بھیجا گیا۔ حلاج کو بلا کر وہ خط پیش کیا گیا کہا کہ یہ خط میرا ہے اور میں نے لکھا ہے۔

لوگوں نے کہا پہلے تو صرف تم نبوت کا دعوٰی کرتے تھے اب الوہیت کا بھی دعوٰی کرنے لگے بعضوں نے لکھا ہے کہ اس کے قتل کا فیصلہ جناب سید الطائفہ جنید بغدادی نے صادر فرمایا لیکن بعضوں نے اس سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ قتل حلاج کے زمانے میں آپ حیات نہیں تھے۔ آپ سے اس واقعہ کا منسوب کرنا شرارت ہے۔ اکثروں کی رائے یہ ہے کہ سب سے پہلے اس معاملہ پر جریری شبلی اور ابن عطار سے پوچھا گیا۔ جریری نے کہا۔ یہ شخص کافر ہے اور واجب القتل ہے۔ شبلی نے کہا۔ جو شخص ایسا کہے اسے نظر بند کیا جائے۔ ابن عطار سے پوچھا تو انہوں نے حلاج ہی کی طرز پر جواب دیا۔ یہی ان کے قتل کا سبب ہوا۔

شیخ ابو عبداللہ خفیف سے۔ علیے بن فورک نے ان اشعار کا مطلب دریافت کیا۔

سبحان من اظھر ناسوتہ — سرسنا لاھوتہ الثاقب

ثم بدا فی خلقہ ظاھرا — فی صورۃ الآکل والشارب

حتی لقد عاینہ خلقہ — کلحظۃ الحاجب بالحاجب

ترجمہ پاک ہے وہ ذات جس نے عالم ناسوت کو لاہوت درخشاں کی روشنی کے راز کا مظہر

بنایا۔ پھر اپنی مخلوق میں کھلم کھلا کھانے پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اسے اس طرح سے دیکھا جیسے دونوں بھنویں مقابلے میں دکھائی دیتی ہیں۔ شیخ نے یہ اشعار سن کر کہا ایسے شخص پر خدا کی لعنت جس کا یہ کلام ہے۔ فورک نے کہا یہ اشعار منصور بن حسین حلاج کے ہیں۔ شیخ نے کہا اگر یہ اشعار منصور کے ہیں تو وہ کافر ہیں۔

ابوالقاسم اسمٰعیل بن محمد بن زنجی نے اپنے باپ سے روایت کی کہ بنت سمری حامد وزیر کے پاس بھیجی گئی۔ حامد نے اس سے حلاج کے متعلق سوال کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میرے والد مجھے اس کے پاس لے گئے اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے تیری شادی اپنے بیٹے سلیمان سے کر دی جو نیشا پور میں رہتا ہے۔ جب میری اور تمہاری مرضی کے خلاف ہو تو تم دن کو روزہ رکھنا اور شام کو کوٹھے پر چڑھنا اور بغیر پیسے ہوئے نمک سے روزہ کھولنا۔ اور منہ میری طرف کرنا۔ اور جو بات تمہیں ناگوار گزرے مجھے یاد دلانا۔ میں ہر بات کو سنتا اور دیکھتا ہوں۔ بنت سمری نے کہا کہ ایک دن میں کوٹھے پر سو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ حلاج مجھ سے آ لپٹے۔ میں ان کی اس حرکت سے خوف کے مارے کانپنے لگی اور جاگ اٹھی۔ حلاج نے کہا میں تمہیں صرف نماز کے لیے جگانے آیا تھا۔ جب ہم کوٹھے سے نیچے اترے تو حلاج کی بیٹی نے مجھ سے کہا انہیں سجدہ کرو۔ میں نے کہا کہیں کوئی غیر اللہ کو بھی سجدہ کرتا ہے۔ اس پر حلاج نے کہا۔ ہاں ایک خدا آسمان پر ہے اور ایک زمین پر۔

حلاج کے زمانے کے جن علماء نے اسے واجب القتل قرار دیا ان میں ابو عمر قاضی کا نام سر فہرست ہے پھر تمام علماء نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ فقط ابوالعباس شریح نے خاموشی اختیار کی اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حلاج کیا کہتا ہے۔ ابوبکر محمد بن داؤد اصفہانی نے کہا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ پر نازل کیا ہے اگر وہ حق ہے تو جو کچھ حلاج کہتا ہے وہ باطل ہے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ جنید بغدادی کے خلیفہ و مرید ابوبکر شبلی نے شدت کے ساتھ حلاج کی مخالفت کی۔

کہتے ہیں خلیفہ بغداد نے باوجود قتل کا فیصلہ ہو جانے کے منصور کو اتمام حجت کے

لیے ایک سال تک زنداں میں رکھا۔ خلیفہ مقتدر باللہ نے آخری فیصلے کے لیے جناب جنید بغدادی کے فتوے کا انتظار کیا۔ بالآخر آپ کو بھی یہی فیصلہ کرنا پڑا اور اس پر مہر تصدیق ثبت کرنی پڑی کہ منصور کے ظاہر کی جو صورت ہے اس کے اعتبار سے تو واجب القتل ہے۔ رہا باطن۔ باطن کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

ممکن ہے کہ جناب جنید نے ایک فقیہہ کی حیثیت سے ضرور فتویٰ دیا ہو مگر جس وقت تعمیل کا وقت پہنچا آپ اس وقت حیات نہیں تھے۔ منصور کو ۳۰۹ھ میں سولی پر لٹکایا گیا۔ پھر اس کی لاش سولی سے اتار کر جلائی گئی اور اسے دریا میں بہا دیا گیا۔

سفینۃ الاولیاء میں دارا شکوہ نے اس سے نہ صرف انکار کیا ہے کہ جناب جنید بغدادی نے منصور کے قتل کا فتویٰ دیا بلکہ اسے ایک شرارت قرار دیا ہے جو حضرت جنید کے خلاف علماء اسلام کی طرف سے کی گئی۔ لکھا ہے کہ قتل منصور کا واقعہ حضرت جنید کے انتقال کے گیارہ بارہ سال کے بعد ہوا۔

سفینۃ اولیاء میں جناب جنید بغدادی کی تاریخ وفات ۲۹۷ ہجری لکھی ہے اور بیان کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ ۲۶۹ ہجری میں ہوئی لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ منصور حلاج کے واقعہ قتل کی تاریخ ۲۵ ذوالحجہ سنہ ۳۰۹ ہجری بیان کی ہے۔

اب اس بیان کی روشنی میں یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جن علمائے اسلام صوفیائے عظام اور اولیائے کرام نے منصور کو پسند نہیں کیا ان کا ناپسند کرنا محض ان کے ذاتی خیالات و معتقدات کا نتیجہ نہیں تھا۔

علامہ جوزی نے لکھا ہے کہ اصل میں تصوف جدید میں ایک گروہ ایسا بھی ملتا ہے جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا ہی میں ہو جاتا ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ممکن ہے شہر کے گلی کوچے میں کوئی خدا ہو۔

انہی کے ایک گروہ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ خدا ان کے پاس آتا ہے اور وہ خدا کے پاس جاتے ہیں۔ عراق میں یہ گروہ اصحاب الناظر اصحاب الوساوس اور اصحاب الخطرات

کہلاتا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے منصور حلاج کو شیر بیشۂ تحقیق کے نام سے یاد کیا ہے اس کی حمایت کی ہے اور اس کے رمز و کنایے کو باطنی علم کہا ہے۔

منصور ہمہ وقت ایک استغراق کی حالت میں رہتا تھا اور کہتے ہیں اسی عالم میں اس سے خوارق عادات و کرامات ظہور میں آئیں جن میں ایک یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز وہ اپنے حلاج دوست کے پاس گیا۔ اور عالم استغراق میں انگلی کے ایک اشارے سے روئی دھننے لگا حلاج روئی دھننے والے کو کہتے ہیں چنانچہ اس واقعہ سے وہ حسین بن منصور سے منصور حلاج مشہور ہو گیا۔

منصور کے بارے میں جناب مخدوم علی ہجویری اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں فرماتے ہیں کہ منصور حلاج طریقت کے اہل حال اور مستوں میں سے ہیں۔ مشائخ ان کے احوال کی ماہیت کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض نزدیک منصور حلاج کا طریقہ مردود ہے اور بعض کے نزدیک مقبول۔ جس گروہ نے منصور حلاج کو پسند نہیں کیا ان میں سے عمر بن عثمان مکی۔ ابو یعقوب نہر جوری ابو یعقوب اقطع اور علی بن اصفہانی وغیرہ ہم ہیں اور جس گروہ نے حلاج کے طریقے کو پسند کیا ہے ان میں سے ابن عطاء محمد بن حنیف ابوالقاسم بصر آبادی وغیرہ ہم ہیں۔ اور جن بزرگوں نے حلاج کے بارے میں خاموشی اختیار کی اور توقف کیا ان میں سے جنید بغدادی۔ شبلی جریری اور حصرمی ہیں ایک گروہ نے منصور کو جادو سحر اور اس کے اسباب و عوامل سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں شیخ المشائخ ابو سعید ابوالخیر شیخ ابوالقاسم گرگانی اور شیخ ابوالعباس شقانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو راز میں رکھا ہے مگر ہم اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں ہمیں ان کی ولایت سے جتنے علامات و دلائل نظر آتے ہیں انہیں سامنے رکھتے ہوئے انہیں بزرگ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے میں نے منصور کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے، جن مشایخ نے منصور کو پسند نہیں کیا۔ ان کا رد کرنا ان کی بے دینی کے سبب

نہیں تھا بلکہ منصور کی عجیب و غریب کیفیت حال کے باعث ہے جس کا سمجھنا ان کی سمجھ سے باہر ہے۔

منصور ابتداء میں سہیل بن عبداللہ کا مرید تھا۔ پھر ان کی اجازت کے بغیر عمرو بن عثمان مکی کی خدمت میں چلا گیا اور ان کا مرید ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی اجازت لیے بغیر چلا گیا اور جناب بغدادی سے تعلق پیدا کرنا چاہا مگر انہوں نے اسے اپنی صحبت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ درحقیقت منصور غیر معمولی مستی کے معیار کی تلاش کرتا پھرتا تھا جو اسے ابھی میسر نہیں آیا تھا۔ پس علماء نے اسے محض معاملات ظاہری و رسمی کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ مخدوم علی ہجویری فرماتے ہیں

مجھ علی بن عثمان جلابی کے دل میں جناب منصور کی بڑی محبت تھی لیکن ان کے مسلک کی چونکہ کوئی بنیاد نہیں اور نہ ان کا حال کسی محل پر قرار پذیر ہے۔ اس لیے میرے نزدیک منصور کا کلام عملی طور پر قطعی پیروی کے لائق نہیں۔

جناب مخدوم علی ہجویری نے اپنے بیان میں حلاج پر جو تنقید کی ہے اس کی رو سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جناب ابوبکر شبلی نے باوجود جلال طبیعت پانے کے منصور سے تعرض نہیں کیا۔ لیکن بعض ثقہ بزرگوں نے اس واقعہ پر جناب ابوبکر شبلی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ منصور کی مخالفت میں آپ نے بڑی شدت اختیار کی۔

جناب سید مخدوم علی ہجویری نے کشف المحجوب میں جناب شبلی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ کہ شبلی نے منصور کے بارے میں فرمایا انا والحلاج فی شیٔ واحد فخلصنی جنونی واھلکہ عقلہ میں اور حلاج دونوں ایک ہی حالت میں ہیں، میں نے تو جنون سے اپنی جان بچائی مگر حلاج نے عقل سے اپنی جان گنوائی۔

ابوبکر شبلی ابوبکر بن دلف جحدر شبلی، بعضوں نے جعفر بن یونس لکھا ہے، ولادت ۲۴۷ ہجری سامرہ علاقہ عراق میں پیدا ہوئے اور شبلہ میں پرورش پائی۔ اسی مناسبت سے آپ شبلی کہلاتے ہیں۔

شبلہ ایک گاؤں کا نام ہے جو سمرقند سے آگے شہر اسروشنہ کے اطراف میں واقعہ تھا۔ آپ کے خاندان کے افراد کسی زمانے میں عراق سے نکل کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

آپ نسلاً مصری تھے کہ ترکی اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ کسی نے آپ کو ترکی الاصل سمجھا ہے، کسی نے خراسانی لکھا ہے اور کسی کے نزدیک آپ مصری تھے۔

آپ کے والد ایک صاحب اثر و ثروت سردار تھے۔ آپ کے خاندان میں چونکہ دنیاوی وجاہت کے سوا کوئی علمی فضیلت نہیں تھی اس لیے آپ کی تعلیم کے بارے میں کچھ ٹھیک معلوم نہیں کہ کہاں پائی اور کن کن بزرگوں سے اکتسابِ علم کیا۔ البتہ اتنا ضرور علم ہے کہ آپ کا خاندان فقہ مالکی پر عمل کرتا تھا اور آپ نے تیس برس تک فقہ پڑھی۔ موطا امام مالک آپ کو زبانی یاد تھی۔

شبلی نے تعلیم سے فراغت پا کر شاہی ملازمت اختیار کر لی اور اپنے خاندان کی فوجی خدمات کے صلے میں نہاوند کے گورنر بنائے گئے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ عباسی خلیفہ المعتضد باللہ کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تمام بغداد نئی نویلی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا تمام ملکوں کے گورنر خلیفہ کے سامنے باادب ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ سوئے اتفاق سے ایک گورنر کو چھینک آ گئی اور ناک سے رطوبت بہنے لگی۔ کوئی رومال پاس نہیں تھا۔ ناک پاک کر لی۔ خلیفہ نے گورنر کی اس حرکت کو دیکھ لیا۔ فوراً عتاب ہوا۔ گورنری جاتی رہی، خلعت چھین کر سخت بے عزت کر کے دربار سے نکال دیا۔

شبلی نے اس معاملے کو دیکھ کر اپنے دل میں خیال کیا کہ جس شخص نے شاہی آداب کو ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ شاہی خلعت کی توقیر نہ کی اس کا تو یہ انجام ہو مگر جو شخص حاکم الحاکمین کے خلعت کا احترام نہ کرے اور آداب خداوندی اس کے پیش نظر نہ ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس واقعہ نے آپ کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ گورنری کو لات مار کر فقیر ہو گئے۔ مگر کس کے فقیر ہوئے لوگوں کے در کے۔ نہیں۔ اللہ کے گھر کے۔ اللہ کی محبت کے۔

اب شبلی کی حالت یہ تھی کہ جس شخص کے منہ سے اللہ کا لفظ نکل جاتا۔ اس کا منہ اشرفیوں سے

پھر دیتے۔ پھر ایک زمانہ ان کی جذبیت کا ایسا آیا کہ ننگی تلوار لے کر پھرا کرتے اور کہتے جو شخص خدا کا نام زبان پر لائے گا اس کا سر قلم کر دوں گا۔

لوگوں کو ان سے خوف آتا تھا۔ مگر ہمت کر کے ایک دن ایک شخص نے پوچھ ہی لیا کہ آپ اللہ کا نام لینے والوں کو قتل کرنے کے کیوں درپے ہیں؟ فرمایا لوگ عادت پڑ جانے کے سبب اللہ کہتے ہیں ورنہ ان کے دلوں میں ارادہ اور خلوص نہیں رہا۔

ایک روز اللہ سے دعا کی اے پروردگار مجھے دو عالم عطا کر دے تاکہ میں ان کو نوالہ بنا کر کسی یہودی کے منہ میں رکھ دوں مجھے تیری محبت کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔

لکھا ہے کہ فقیری اختیار کرنے کے بعد جب آپ کسی صاحب نظر کی تلاش کرتے ہوئے جناب جنید بغدادی کی خدمت میں پہنچے تو بغدادی علیہ الرحمہ نے آپ کو اپنی صحبت میں اس شرط پر لینا قبول کیا۔ کہ آپ شدید سے شدید مجاہدے ریاضتیں کریں گے اور ان سے مطلق نہیں گھبرائیں گے۔

کہتے ہیں جناب جنید بغدادی نے آپ کے مزاج سے گورنری کی بو باس نکالنے اور طبیعت میں عجز و انکسار پیدا کرنے کے لیے آپ کو بھیک مانگنے پر مقرر کیا۔

چنانچہ آپ روزانہ بھیک مانگنے جاتے اور جو کچھ لوگوں سے میسر آتا اسے لاکر فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے مگر خود بھوکے رہتے۔ لکھا ہے کہ بھیک مانگنے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آتی۔ لوگ سمجھتے کہ آپ محتاج و بے کس نہیں ہیں اس لیے کچھ نہ دیتے مگر پھر بھی جوں توں کر کے مرشد کی تعمیل میں آپ کو کچھ نہ کچھ لانا ہی پڑتا۔

ایک روز آپ سے جناب جنید نے پوچھا۔ شبلی کہو اب تمہارے نفس کا کیا مرتبہ ہے؟ عرض کیا اب اپنے آپ کو تمام لوگوں سے ادنے درجہ پہ پاتا ہوں۔

اگرچہ معلوم نہیں یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ آپ کی بے نفسی و بے پروائی کے بارے میں ـ مطلقاً کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ۔

شبلی نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد ۳۳۴ ہجری میں وفات پائی۔

مخدوم علی ہجویریؒ

ولادت۔ ۴۰۰ ہجری۔ میں غزنی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی عثمان۔ اور آپ کا نام نامی علی ہے آپ کے گھر کے لوگ پہلے غزنی کے ایک قصبے ہجویر میں رہتے تھے۔ پھر ہجویر کے قریب ہی ایک اور قصبے جلاب میں آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی چنانچہ آپ اسی مناسبت سے ہجویری و جلابی کہلاتے ہیں۔

آپ نجیب الطرفین حسنی سید ہیں۔ نسب نامہ یوں ہے۔ علی بن عثمان بن علی بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی الحسن بن حسن بن زید شہید بن جناب امام شہید حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ گویا نو واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی سے جا ملتا ہے۔

فقہی مسلک کے اعتبار سے آپ حنفی تھے آپ کو جناب امام اعظم ابو حنیفہ سے بہت محبت تھی مسلک طریقت کے لحاظ سے آپ سید الطائفہ جنید بغدادی کے پیرو تھے۔

آپ کے مرشد جناب خواجہ ابوالفضل ختلی غزنوی سلسلہ جنیدیہ کے بزرگ تھے۔ جناب ختلی حضرت علی حصری کے مرید تھے حصری جناب شیخ شبلی کے مرید تھے۔ شبلی جناب سید الطائفہ جنید بغدادی کے مرید تھے۔ جنید بغدادی جناب شیخ سری سقطی کے مرید تھے۔ سقطی جناب شیخ معروف کرخی کے مرید تھے۔ کرخی جناب شیخ داؤد طائی کے مرید تھے طائی جناب حبیب عجمی کے مرید تھے۔ عجمی جناب خواجہ حسن بصری کے اور خواجہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مرید و شاگرد تھے۔ گویا اس لحاظ سے آپ کو جناب علی کرم اللہ وجہہ سے دوہری مناسبت ہے۔

آپ کی تعلیم کے متعلق کچھ تفصیل سے معلوم نہیں کہ آپ نے کن کن بزرگوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ البتہ آپ کی تصنیفات کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ علوم دین، فقہ، تفسیر و حدیث میں تبحر کامل رکھتے تھے۔

کہتے ہیں شیخ بزرگ نام ایک ولی سے آپ کی ملاقات ہوئی اس وقت مشکل سے آپ کی عمر بارہ سال کی ہوگی۔ شیخ بزرگ نے آپ سے علم تصوف پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو آپ نے اپنی لکھی ہوئی کتاب لاکر ان کی خدمت میں پیش کی اور طالب دعا ہوئے۔

شیخ بزرگ نے فرمایا۔ اے علی مستقبل میں تمہارا نام مطلع تصوف پر سورج کی طرح چمکے گا چنانچہ ان کی یہ پیشگوئی حرف بحرف صحیح نکلی۔

جناب ہجویری نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے لیے شام۔ عراق۔ بغداد۔ پارس۔ کرمان۔ خراسان ماوراء النہر اور ترکستان کا سفر کیا۔ وہاں کے علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لکھا ہے کہ جن بزرگوں سے آپ نے اکتساب کیا ان کی تعداد تین سو سے اوپر ہے۔ مگر جن دو ایک بزرگوں کی روح پرور صحبتوں سے بالخصوص فائدہ اٹھایا ان کا ذکر آپ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں کیا ہے ان میں سے ایک جناب ابوالقاسم قشیری دوسرے جناب ابوالقاسم گرگانی اور تیسرے جناب شیخ ابوسعید ابوالخیر کی ذات گرامی ہے۔

آپ تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے اور یہاں آپ نے علوم دین اور اشاعت اسلامی کا ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کیا جس سے چھوٹے بڑے ادنیٰ و اعلیٰ سبھی سیراب و فیضیاب ہوئے۔

ورود لاہور لاہور میں آپ کی آمد سے پہلے پنجاب کی سیاسی حالت کیا تھی؟ اس سے متعلق جاننے کے لیے ہمیں امیر سبکتگین شاہ غزنی کی فتوحات کے سلسلے پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ جس کا مقصد بظاہر ہندوستان کو فتح کر کے سلطنت غزنہ کی توسیع

دکھائی دیتا ہے لیکن بباطن وہ شوق جہاد تھا جیسے لے کر امیر سبکتگین بار بار یہاں آتا تھا۔ ۳۶۷ھ ہجری میں سبکتگین جب اہل ہند سے جہاد کرنے کے لیے جاں نثاران اسلام کو لے کر نکلا اس نے ہندوستان کے متعدد قلعے فتح کر لیے اور ظلمت کدہ ہند میں اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے اکثر جگہوں پر مسجدیں تعمیر کروا کے واپس آ گیا۔

اس زمانے میں راجہ جے پال کے حدود سلطنت لاہور سے ملتان اور کشمیر سے پشاور تک تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ امیر سبکتگین نے اس کے بہت سے قلعے اور ملحقہ علاقے فتح کر لیے ہیں تو اس کو سخت فکر و انگیر ہوئی چنانچہ اب اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ امیر سبکتگین سے لڑنے کی ٹھان لی اور جب امیر کو اس برہمن زادے کے ارادے کا علم ہوا تو وہ بھی ایک لشکر جرار لے کر پشاور کو چل پڑا۔

لمغان جو کابل اور پشاور کے درمیان واقع تھا۔ اس کے میدان میں دونوں لشکر صف آرا ہوئے گھمسان کا رن پڑا۔ فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی بھی اس لڑائی میں اپنے باپ کے ساتھ شریک تھا۔ اس نے باوجود نہایت کم سن ہونے کے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔

اب راجہ جے پال نے امیر سبکتگین کے حضور میں صلح کی درخواست پیش کی ہر چند سلطان محمود غزنوی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ برہمن زادہ دھوکہ دے رہا ہے تاہم امیر سبکتگین ایک بادشاہ کی حیثیت سے رضا مند ہو گیا چنانچہ یہ طے ہوا کہ جے پال ایک لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی نذرانے کے پیش کرے۔

اگرچہ جے پال نے صلح کی اس شرط کو بظاہر منظور کر لیا۔ لیکن بباطن اس کی نیت خراب تھی چنانچہ اس نے مذکورہ شرط کے پورا کرنے کے بہانے سے حکومت کے ایک معتبر رکن دت کو امیر سبکتگین کے پاس رہن رکھ کر دارالسلطنت کی راہ لی۔

مگر مسلمانوں کی ایک جماعت جسے وہ نذرانے کی مذکورہ رقم ادا کرنے کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا بھٹنڈہ پہنچ کر اسے قید کر لیا اور سبکتگین کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ نہایت

غضبناک ہو کر اسے بد عہدی کی سزا دینے کے لیے ہندوستان کی طرف پھر چل پڑا۔

ادھر جے پال نے ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں کو لکھ کر بھیجا کہ تمہاری آزادی سخت خطرے میں ہے مسلمانوں کی ہلاکت خیزیوں کا ایک شدید طوفان ہندوستان کی جانب چلا آرہا ہے۔ اگر اس وقت تم نے میری مدد کے لیے فوجیں نہ بھیجیں تو ہم سب مٹ جائیں گے چنانچہ ہندوستان کے تمام راجاؤں نے باوجود جے پال سے ذاتی اختلافات اور دشمنی رکھنے کے امیر سبکتگین کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے اپنے لشکر بھیج دیئے کہتے ہیں جے پال کے جھنڈے تلے امیر سبکتگین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک لاکھ ہندوستانی سورماؤں کا لشکر جمع ہو گیا۔

اب ایک طرف تو عالم یہ تھا کہ جدھر نگاہ اٹھتی انسانی سروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا اور دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ امیر سبکتگینؒ کے پاس چند ہزار افغانی سپاہیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر امیر کی ہمت کی داد دیجیے اس نے حوصلہ نہیں ہارا اس نے کمال حکمت عملی سے کام لے کر اپنے لشکر کے پانچ پانچ سو کے دستے بنائے اور انہیں باری باری یکے بعد دیگرے دشمن کے مقابلے پر بھیجنا شروع کیا۔ قدرت خدا مسلمانوں کے استقلال و پامردی نے چند ہی دنوں میں جے پال کی فوجوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ یہاں تک کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے لگیں یہ دیکھ کر مسلمانوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور مولی گاجر کی طرح کاٹنا شروع کر دیا مختصر یہ کہ مسلمان پنجاب کے بہت سے حصوں پر قابض ہو گئے

۳۸۷ ہجری میں امیر سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کا اقبالمند فرزند ارجمند سلطان محمود سریر آرائے حکومت ہوا۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیئے اگرچہ اسکی بت شکنی نے ہندوؤں کے معتقدات باطلہ پر زبردست ضربیں لگائیں۔ اس نے سومنات کے شہرہ آفاق مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ہندوستان کی تمام بڑی بڑی طاقتوں کے چھکے چھڑا دیئے مختصر کہ جس نے اس کے سامنے سر اٹھایا اس نے اسے کچل کے رکھ دیا یہ سب کچھ درست بجا۔ یقیناً وہ ایک قابل تقلید اور ستائش کے لائق مسلمان بادشاہ تھا۔ مگر ظلمت کدہ ہند میں اسلام کی روشنی

پھیلانے سے قاصر رہا۔

سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کیا جس کے سبب پنجاب محمود غزنوی کی سلطنت میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گیا۔ لیکن محمود نے اقامت اختیار نہیں کی بلکہ اپنا ایک گورنر چھوڑ کر غزنی واپس چلا گیا۔ لاہور کے پہلے گورنر کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ سب سے پہلا گورنر سلطان محمود کا بیٹا امیر مجدود تھا۔ بعض کہتے ہیں نہیں! سلطان کا مقرب خاص غلام ایاز تھا۔ جو لوگ امیر مجدود کو لاہور کا گورنر بناتے ہیں وہ ایاز کو اس کا اتالیق ٹھہراتے ہیں۔

۱۴ ربیع الاول ۴۲۱ھ ہجری میں سلطان محمود غزنوی نے رحلت پائی اس کے بعد سلطان کا بیٹا امیر مسعود مسند نشین ہوا۔ ۴۲۸ھ ہجری میں امیر مسعود باغیوں اور سرکشوں کی گوشمالی کے لیے ہندوستان آیا۔ اس نے آکر ہانسی اور سونی پت کے قلعے فتح کیے اور پھر فتح و کامرانی کے ڈنکے بجاتا ہوا غزنی واپس چلا گیا۔

گویا تسخیر قلوب اہل ہند کا کام ابھی تک باقی تھا جو امیر سبکتگین کی تیغ آبدار سے ہو سکا نہ سلطان محمود کی شمشیر جوہر دار کر سکی اور نہ اس کے فرزند امیر مسعود ہی کی تلوار براں سے ہو سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ دل کی سلطنت پر قبضہ پانا کسی بادشاہ کے بس کا روگ نہیں۔ کوئی بادشاہ کیسا ہی جری اور کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو۔ دلوں پر فتح نہیں پا سکتا۔

دل و دماغ کی تسخیر کے لیے روحانی قوت کی ضرورت ہے اور یہ قوت صرف انہی کے حصے میں آتی ہے۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول کے ذکر اور اس کی یاد سے دماغ کو پاکیزہ اور دل کو آباد کرتے ہیں۔ روح ایک لطیف شے ہے جن بزرگوں کو روحانی لطافتیں حاصل ہو جاتی ہیں وہ اپنے آپ کو دنیاوی کثافتوں اور جسمانی لذتوں سے آلودہ نہیں کرتے۔

بعض ناعاقبت اندیش بزرگان دین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ظلمت کدہ ہند میں ان کی آمد شاہان اسلام کے ایما پر سیاسی اغراض و مصالح پر مبنی تھی۔

لیکن بزرگان دین کے سوانح حیات میں جب ترک لذائذ دنیوی پر ہم پہنچتے ہیں تو نشرط

انصاف یہ ہے کہ پیران کے اخلاص اور نیت پر شبہ کرنے کی مطلق کوئی گنجائش نہیں رہتی یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ دین اسلام کی محبت اور جناب محمد رسول اللہ کی الفت ہی وہ سرمایہ حیات ہے جسے لے کر بزرگان دین ظلمت کدہ ہند میں روشنی پھیلانے کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہے۔

جناب شیخ ہجویری سے پہلے جناب شیخ اسمٰعیل۔ اور شاہ حسین زنجانی لاہور میں تشریف لا چکے تھے۔ اب جناب شیخ ہجویری کی آمد ہو رہی ہے۔ سلطان محمود نے ہندوستان پر جتنے حملے کیے ان کی نوعیت فقط فتوحات کی ہے اور ایک سلطان ہی پہ کیا موقوف جتنے شاہان اسلام نے ہندوستان کو اپنی تلوار و شجاعت کے جوہر دکھائے ان میں سے کسی ایک نے بھی ظلمت کدہ ہند میں عیسائیوں کی طرح مشنری سکول اور کالج قائم کر کے اسلام کی تعلیمات پھیلانے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی۔

آپ کے یہاں آنے سے سے پہلے ہندوستان کی سیاسی حالت تو یہ تھی۔ تمدنی اور معاشی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ حال یہ تھا کہ لوگ تہذیب و تمدن سے اس قدر بیگانہ تھے کہ بھوک لگنے پر درندوں کی طرح اپنے سے کمزور انسانوں کو ہی چیر پھاڑ کر کھا لیتے تھے۔

ظاہر ہے ایسے حالات میں ہندوستان کی مذہبی معاشی اور سیاسی حالت کا کیا نقشہ ہو گا۔
جب آپ علوم ظاہری و باطنی میں تکمیل پا چکے ۔ تو آپ کے پیر و مرشد جناب ابو الفضل ختلی نے آپ کو لاہور جانے کا حکم دیا۔

آپ کے لاہور آنے سے پہلے یہاں ایک عارف کامل ولی باکرامت شیخ حسین زنجانی ایک اور بزرگ پہلے سے موجود تھے۔ آپ نے اپنے مرشد کو لاہور میں ان کی موجودگی کی طرف توجہ دلائی۔ جناب ختلی نے فرمایا۔ نہیں تم جاؤ۔ تم اس سے کیا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل پا کر آپ لاہور کو روانہ ہوئے۔

قدرت خدا دیکھیے کہ آپ جس وقت لاہور میں داخل ہو رہے تھے تو جس کی طرف آپ نے مرشد کی خدمت میں اشارہ کیا تھا یعنی دار الفنا سے حسین زنجانی ولد البقا کی طرف جا رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ یہ شیخ حسین زنجانی کا جنازہ تھا مگر بعضوں نے ان کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بہرکیف یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ کے دین کی طرف لوگوں کو بلانے والے کسی بزرگ کا جنازہ تھا جو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ جب اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کا وقت ختم ہو گیا۔ تو آپ لاہور میں تشریف لائے اور یہیں عمر بھر قیام کیا۔

شہر لاہور کے باہر مغربی حصہ میں ہندوؤں کا ایک مندر تھا اور اس کے قریب ہی دریائے راوی گزرتا تھا۔ آپ نے اس مقام کو دیکھ کر فرمایا کہ یہی جگہ ہم فقیروں کے رہنے کے لیے موزوں رہے گی۔ چنانچہ جہاں آج ظلمت کدہ ہند کو نور ایمان سے منور کر کے آپ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آپ نے لاہور پہنچ کر قیام فرمایا اور اسے تبلیغ اسلام و اشاعت دین کا مرکز بنایا۔

تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ نے لاہور میں چھتیس ۳۶ برس تک قیام فرمایا ہے اس عرصہ میں آپ نے جو تالیف قلوب کی طرف توجہ دی ہے اس کا ایک اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لوگ آپ کو داتا اور گنج بخش کے نام سے پکارنے لگے۔

آپ اپنی کتاب کشف الاسرار میں لکھتے ہیں کہ اے علی تجھے خلقت گنج بخش کہتی ہے، حالانکہ تیرے پاس ایک دانہ تک نہیں تو اس لقب کا خیال اپنے دل میں پیدا نہ کر اور یہ نہ سوچ کہ تجھے لوگوں میں کس قدر مقبولیت حاصل ہے اگر تو نے ایسا خیال کر لیا تو گنہگار ہو گا۔

"گنج بخش" تو فقط وہی ایک پاک ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا۔ اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ اس کی ذات شرک سے پاک ہے۔ خدا وحدہ لاشریک ہے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو سمجھ لے کہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

آپ کی اس تحریر سے ایک طرف تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے لاہور آنے سے پہلے یہاں کے رہنے والے کس حال میں تھے۔ ان کے اعتقادات یا معتقدات پر کیسی کیسی غیر اسلامی باتوں کا غلبہ تھا۔ دوسری طرف آپ کی سیرت کے وہ پہلو دکھائی دیتے ہیں جن

نے متاثر ہو کر یہاں کے رہنے والوں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا اور انہیں
آپ سے اس قدر محبت بڑھی کہ آپ کے لیے فرطِ جوش میں "داتا" اور داتا گنج بخش" ایسے غیر اسلامی
لفظ مُنہ سے نکالنے لگے۔

بعضوں نے لکھا ہے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی لاہور تشریف لائے۔ اور
آپ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہوئے اور چلہ کشی کی تو لاہور سے جاتے ہوئے فرطِ جوش میں
آپ نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

کہتے ہیں اس وقت سے آپ گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ شعر کی ترکیب پر غور کیا جائے
تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترکیب غلط ہے اس لیے وہ خواجہ معین الدین چشتی کا شعر نہیں ہو سکتا
اس اعتبار سے پھر یہ بات بھی نہیں کی جا سکتی کہ آپ خواجہ کے شعر سے گنج بخش مشہور ہوئے
ہو سکتا ہے کہ یہ کسی غیر معروف شاعر کا شعر ہو۔ مگر شعر کی روشنی میں بھی یہ بات قطعی اور
حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ آپ لوگوں میں پہلے ہی سے "گنج بخش" مشہور تھے۔ ورنہ شاعر کا
ذہن کیونکر اس ترکیب کی طرف جاتا اور اسے اپنے شعر میں باندھتا۔

آپ کی سوانح حیات میں راؤ راجو کی مزاحمت کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے لاہور کے
ہندو اکثر اس کے بندہ بے دام تھے۔ اور کسی طرح اس کے حلقہ غلامی سے نہیں نکل سکتے تھے۔
آپ نے اس کے تمام طلسمات کو ایک ایک کر کے توڑ دیا اور آپ کی ایک ہی نگاہِ التفات
نے اسے راؤ راجو سے شیخ ہندی بنا دیا۔

راؤ نے جو کہ سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا گورنر تھا۔ آپ کے
علم و عمل اور زہد و تقوے کی جو شان دیکھی۔ تو آپ کے قدموں میں گر کے مسلمان ہوا۔ اور
شیخ ہندی کا لقب پا کر آپ کے حلقہ ارادت مندی میں شامل ہو گیا۔

مارشل لاء سے پہلے تک شیخ ہندی کی اولاد ہی شروع سے آپ کے مزار مبارک پہ مجاوری کرتی چلی آئی ہے اب ۱۹۶۰ء سے حکومت پاکستان نے آپ کی خانقاہ لنگر اور مزار مبارک کے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔

جو فیض بندگان خدا کو آپ کی زندگی میں پہنچ رہا تھا وہی فیض اب حکومت کے توسل سے دوبارہ جاری ہو گیا۔ جو لوگ نذر نیاز کی رقمیں یہاں لا کر پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ رائگاں نہیں جاتیں بلکہ ان سے آپ کی حیات مبارکہ کا وہی مشن پورا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جسے لے کر آپ غزنی سے ظلمت کدہ ہند میں وارد ہوئے تھے۔

جس مقام پر آپ نے قیام کیا وہاں آپ نے اپنی جیب سے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ہی ایک مدرسہ قائم کیا جہاں اللہ اور اللہ کے رسول کا نام بلند ہوا اور اس کے دین کے فروغ و اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

آپ کے ورود مسعود سے پہلے ظلمت کدۂ ہند کی جو حالت تھی اس کا مختصراً حال پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ایک اجمال علم تصوف کا بھی ملاحظہ کیجیے وہ لوگ جو صوفیوں کا لبادہ اوڑھ کر ارباب حدیث (اہل تصوف) کے گروہ میں طرح طرح کے غیر اسلامی خیالات لے کر داخل ہو گئے تھے جن سے علم تصوف کی لوگوں کی نگاہ سے وقعت جاتی رہی آپ نے ان کی اصلاح اور ارباب حدیث کے مسلک (تصوف) کی مدافعت میں اپنی مشہور کتاب کشف المحجوب تصنیف کی۔ جس میں ان تمام غیر اسلامی خیالات و معتقدات کا ابطال کیا جس نے تصوف کو قطعی عجمی ذہن کی پیداوار یا ایرانیوں کی افتاد طبع کا نتیجہ ٹھہرایا۔

کشف المحجوب جس پائے کی کتاب ہے جناب نظام الدین دہلوی محبوب الٰہی کے اس قول سے اس کا ایک اندازہ ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں "جس کا کوئی مرشد نہ ہو وہ کشف المحجوب کو اپنا مرشد بنا لے۔

یوں تو آپ نے کشف المحجوب کے علاوہ اور بھی کئی ایک کتابیں علم تصوف پر تصنیف

کی ہیں مثلاً کشف الاسرار دیوان علی اور منہاج الدین مگر ان سب میں فوقیت صرف کشف المحجوب کو ہے اور اسکے سوا اب آپ کی اور کوئی تصنیف نہیں ملتی۔

کشف المحجوب میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تصوف کے علم پر سب سے پہلی کتاب ہے اور خاص بات یہ ہے کہ کشف المحجوب تصوف کے موضوع پر اس وقت کی ایک مستند کتاب ہے جب کہ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف اور ابن عربی کی فصوص الحکم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں متاخرین صوفیا کے غلو اور نیم نخچت خیالات و معتقدات نہیں ملتے۔ کشف المحجوب میں اولیائے کرام کے خیالات پیش کئے گئے ہیں جن سے تصوف کے بارے میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جو بے علم و بے عمل صوفیوں کی بدولت اس میں پیدا ہوئیں۔ مثلاً کشف المحجوب میں لکھا ہے ابویزید بسطامی کہتے ہیں۔

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ہوا میں معلق ہو کر دو زانو بیٹھ جاتا ہے تو اس کی اس کرامت سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک اس امر کو نہ دیکھ لو کہ حدود شریعت کی حفاظت میں اس کی کیا حالت ہے۔

جو شخص قرآن حکیم کی تلاوت۔ شریعت کی حمایت۔ جماعت کا التزام۔ جنازے کے ساتھ چلنا اور مریضوں کی عیادت کرنا چھوڑ دے اور شان باطنی کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے بدعتی ہے شیخ سری سقطی کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں احکام خداوندی کی پیروی چھوڑ کر علم باطنی کا دعویٰ کرے وہ غلطی پر ہے۔ سید الطائفہ جنید بغدادی کہتے ہیں۔

جس شخص کو کتاب یاد نہیں۔ حدیث نہیں لکھتا فقہ نہیں سیکھتا اس کی پیروی نہ کرو

تصوف کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا۔ تصوف کی اصل یہ ہے کہ دنیا کی محبت سے علیحدہ ہو جائے ابوبکر شفاف کہتے ہیں۔

جو شخص ظاہر میں امر و نہی کی حدود ضائع کر دے وہ باطن میں مشاہدۂ قلبی سے

محروم رہتا ہے۔

ابوالحسن نوری کہتے ہیں۔

جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اسے علم شریعت سے خارج کرے، تم اس کے پاس نہ جاؤ۔

ابو حفص کہتے ہیں۔

جس شخص نے اپنے حال احوال اور افعال و اعمال کو کتاب و سنت کے مطابق نہ تولا اور اپنے خطرات کو تہمت نہ لگائی اسے مردوں کے دفتر میں شمار نہ کرو۔

شیوخ صوفیہ کے ان اقوال کی روشنی میں یہ صاف معلوم ہو گیا کہ جن حضرات نے تصوف میں غیر اسلامی خیالات شامل کئے اور ان پر تصوف جدیدہ کی بنیاد رکھی وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے علم سے منہ موڑ کر فقط زہد و عبادت کو جان تصوف سمجھ لیا۔

دراصل ارباب حدیث جنہیں صوفیائے قدیم کہتے ہیں۔ ان کے مقاصد بڑے پاکیزہ اور نیک تھے۔ لیکن جب تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ چلا اور تصوف کا مسلک ایک مستقل فلسفہ بن گیا۔ تب نام نہاد صوفیوں نے علم سے بے نیازی برتنی شروع کی اور اس پر عزلت گزینی کو ترجیح دی۔ حالانکہ قدیم صوفیائے کرام کا یہ مسلک نہیں تھا۔ مثلاً ربیع بن خثیم کہتے ہیں "پہلے علم حاصل کر پھر گوشہ نشین ہو" ابن عبداللہ کا قول ہے کہ زائد علم زائد عبادت سے بہتر ہے" یوسف ابن اسباط نے فرمایا "علم کا ایک باب حاصل کرنا ستر غزوات سے افضل ہے۔ معافی بن عمران نے کہا کہ ایک حدیث کا لکھنا مجھے تمام رات کی عبادت سے افضل ہے"

علامہ ابن جوزی کہتے ہیں میں نے ایک شخص حسین قزوینی کو دیکھا کہ وہ جامع منصور میں دن کو بہت ٹہلا کرتا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو کہا میں اس بہانے سے نیند کو دور کرتا ہوں میں نے کہا یہ تو شرع کے خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تیرے نفس کا تجھ پہ حق ہے۔ تو نماز کے وقت نماز میں قیام کر اور سونے کے

وقت سو بھی جاتا آدمی کو چاہیئے کہ اعتدال کی راہ اختیار کرے۔

انس بن مالک نے کہا رسول اللہ نے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا کہ ایک رسی چھت سے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے۔ استفسار فرمایا یہ کیا شے ہے؟ عرض کیا کہ یہ زینب کی رسی ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی یا اونگھ آتی ہے تو یہ رسی تھام لیتی ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ اسے کھول دو۔ پھر ارشاد فرمایا کہ تم جب تک چاق وچوبند رہو اس وقت نماز پڑھتے رہو لیکن جب تھکان یا سستی آئے تب اس سے باز رہو۔ جناب عائشہ کہتی ہیں کہ جب تم میں سے کوئی اونگھے تو سو رہے حتیٰ کہ اس کی نیند جاتی رہے اور پھر نماز پڑھے۔

جناب مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مقام و منصب ولایت سے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہاں جناب خواجہ چشتی اور فرید الدین مسعود ایسے جلیل القدر اولیا اللہ آپ کے مزار شریف پر حاضر ہو کر چلہ کشی کر چکے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے تاجداروں اور بادشاہوں نے بھی آپ کے آستانہ پر جبہ سائی کی ہے۔

آپ ترک لذات۔ ذکر الٰہی اور تزکیہ باطن پر بہت زیادہ زور دیتے تھے بالخصوص تجرد پسند تھے آپ نے والدین کے حکم پر نہایت کم عمری ہی میں یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں۔ مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۴۶۵ ہجری میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کا مزار پر انوار لاہور میں مرجع خلائق ہے

شیخ ہجویری اپنے خیالات کے آئینہ میں

کشف المحجوب کے باب ذکر ملامت میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں شیخ ابو یزید کی خانقاہ میں تین مہینے تک رہا۔ میرا قاعدہ تھا کہ روزانہ غسل کر کے بیٹھتا مگر میری وہ مشکل حل نہ ہوئی جسے لے کر میں یہاں پہنچا تھا ناچار یہاں سے خراسان کو روانہ ہوا۔

راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا جب میں وہاں پہنچا تو مجھے متصوفین کی ایک جماعت نظر آئی۔ میں نے ایک اور کھردرا لباس پہنا ہوا تھا۔ اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور پانی کا برتن تھا۔ اس جماعت نے مجھے نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور ان میں سے کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے میرے بارے میں ایک دوسرے سے کہا کہ یہ ہم سے نہیں۔ بے شک میں ان میں سے نہیں تھا۔ لیکن میرے لیے وہاں رات گزارنا بھی ضرور تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے مجھے خانقاہ کے نچلے حصے میں ٹھہرایا اور خود بالائی منزل پہ چلے گئے۔

کھانے کے وقت مجھے ایک سوکھی روٹی دے دی۔ خود بڑے عمدہ کھانے کھا رہے تھے۔ جس کی خوشبو مجھ تک آ رہی تھی۔ وہ کھانا کھا چکے تو خربوزہ کھانے لگے اور از راہ تمسخر چھلکے مجھ پر پھینکتے اور میرا مذاق اڑاتے رہے۔ مگر وہ جس قدر مجھ پہ طنز کرتے اور میرے خلاف باتیں کرتے۔ مجھے ان سے رنج پہنچنے کی بجائے خوشی ہوئی۔ اس طرح ملامت سہنے سے میری وہ مشکل حل ہوگئی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مشائخ اپنے ہاں ان کو کیوں گوارا کر لیتے ہیں۔

جناب شیخ ہجویری اپنی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں۔ سماع کا

سماع ذوق رکھنے والے اصحاب میں سے ایک تو وہ ہیں جو صرف معانی کو سنتے ہیں اور الفاظ و صوت کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اور ایک وہ ہیں جو نغمہ اور آواز پہ مرتے ہیں۔ مؤخر الذکر گروہ کے احوال باطنی پہ تبصرہ و تنقید کرتے ہوئے آگے چل کر پھر آپ فرماتے ہیں۔ نغمہ و صوت سے وابستگی و ذوق رکھنے میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ فائدے کی بات تو یہ ہے کہ حسین و جمیل اور خوشگوار چیزوں کے دیکھنے اور سننے سے دراصل انسان کی طبیعت میں جذبات اور معنی جوش مارتے ہیں اگر وہ جذبات و معنی حق پہ مبنی ہوں تو انسان کی طبیعت میں حق زور پکڑتا ہے اور اگر باطل ہوں تو باطل طبیعت میں راسخ ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ جو شخص طبیعت کے لحاظ سے پہلے ہی سے بد فطرت ہوگا وہ جو کچھ بھی سنے

گا وہ سب شر اور فساد ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص نیک خو اور عمدہ فطرت کا ہوگا وہ جو کچھ بھی سنے گا وہ خیر اور نیک انساد ہوگا۔

جہاں تک اچھی آواز اور نغمہ کا تعلق ہے۔ انسان کی فطرت کا یہ خاصہ ہے۔ کہ وہ اس سے ذوق رکھتا ہے۔ البتہ اس سے انسان کی طبیعت پر جو اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ وہ انسانی طبائع کے مختلف ہونے کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اسی حال کے پیش نظر ہم نغمہ وصوت کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتے۔ یعنی سماع کو نہ تو ضرور و لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اسے ناجائز ہی کہہ سکتے ہیں۔

جناب شیخ ہجویری فرماتے ہیں۔ بنسری، طنبور، سارنگی، ستار اور ڈھولک وغیرہ آلات موسیقی شیطان کی ذریت نے انسان کو گمراہ کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ ان کے سننے سے انسان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور وہ حسن پرستی اور فسق و فجور پر مائل ہو جاتا ہے۔

لحن داؤدی کہ موہبت الٰہی ہے گویا اس کے مقابلے میں شیطان کی اولاد نے اپنی مجلس جمائی چنانچہ جو لوگ جناب داؤد علیہ السلام کی آواز سنتے تھے ذریت شیطان کی اختراعات پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ کو اہل شقاوت کہا گیا دوسرا گروہ اہل سعادت کہلاتا ہے۔

اہل سعادت شیطان کے مزامیر نہیں سنتے انہیں فقط لحن داؤدی ہی پسند ہے لیکن ان کے برعکس اہل شقاوت معنی سے مطلق کوئی واسطہ نہیں رکھتے وہ صرف آواز اور ساز کے شیدائی ہیں حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جو سماع کی حقیقت اور واقفیت سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور کلیۃً حرص و ہوس کے بندے ہیں اور اسی کے دام میں گرفتار ہیں۔

شرع کی رو سے راگ، ساز، ستار باجے وغیرہ مزامیر سننا قطعی ناجائز ہے جو شخص اسے جائز خیال کرتا یا اس کے جائز ہونے کا جواز تلاش کرتا ہے وہ اسلام سے اپنا کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ بعض لوگ سماع کی مجلس میں ناچنے اور اپنے تن کے کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں۔ علمائے حقہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ناچنا فسق و فجور میں داخل ہے اور کپڑے پھاڑنا برہنہ ہونا عریانی میں شامل ہے۔

البتہ وہ لوگ جو شدت جذبات سے ایسا کرتے ہیں جنہیں اپنے آپ کا مطلق ہوش نہیں رہتا وہ اس سے بری ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو صاحبان حال نہیں۔ بلکہ جھوٹی اور مصنوعی واردات وکیفیات قلبی پیدا کر کے ناچنے، گانے یا کپڑے پھاڑنے لگتے ہیں۔ صریحاً مسخرے ہیں اور وہ ایسا کرنے سے بزرگان دین کی تذلیل کا باعث بنتے ہیں ان کا یہ فعل قطعی ناپسندیدہ اور ناجائز ہے صوفیائے اسلام سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔

رقص سے شہوانی جذبات ابھرتے ہیں اور زنا کے فعل کی تحریک ہوتی ہے۔ بلاشبہ رقص شیطان کا حربہ ہے۔ جو نام نہاد صوفی رقص کو جائز خیال کرتے ہیں وہ تصوف تو ایک طرف خود اپنی ذات سے بھی دھوکہ کرتے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک وجد ہی کا دوسرا نام رقص ہے، نہیں یہ بالکل غلط ہے اصل میں وجد و رقص ایک دوسرے سے بالکل دو الگ الگ چیزیں ہیں ان دونوں میں واضح فرق یہ ہے کہ وہ حرکات و سکنات جسم جو رقص میں پیدا ہوتی ہیں وجد میں نہیں ہوتیں وجد ایک زبانی کیفیت ہے اور اس کا صحیح اندازہ صرف وہی اصحاب لگا سکتے ہیں جو صاحب حال ہوں۔

عبدالقادر جیلانی

ولادت ۴۷۰ ہجری قصبہ گیلان شہر فارس میں پیدا ہوئے محی الدین لقب اسم گرامی عبدالقادر، والد کی طرف سے حسنی والدہ کی طرف سے حسینی یعنی نجیب الطرفین ہاشمی سید تھے۔

عربی میں قاعدہ ہے کہ گاف کے حرف کو جیم سے بدل دیتے ہیں اس لیے گیلان کی مناسبت سے آپ کو گیلانی کی بجائے جیلانی کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں آپ کے جد اعلیٰ کا اسم گرامی جیلان ابوعبداللہ صومعی تھا۔ اسی رعایت سے آپ جیلانی کہلاتے ہیں۔ لیکن آپ کے نسب نامہ میں اس نام کے کوئی بزرگ نہیں ملتے اس لیے یہ بیان صحیح نہیں۔ اصل میں آپ کے نانا کا نام ابوعبداللہ صومعی تھا مگر ان کے نام کے ساتھ بھی جیلان کا لفظ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ پس آپ کو جد اعلےٰ کی مناسبت سے جیلانی کہنا درست نہیں۔

(مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں طبقات حنابلہ میں علامہ ابوالفرج عبدالرحمان شہاب نے اور ان کی تائید میں اکثر دیگر تذکرہ نگاروں نے آپ کو والد کی طرف سے حسنی لکھا ہے اور نسب نامہ یوں بیان کیا ہے: شیخ عبدالقادر بن صالح جنگی بن موسیٰ بن عبداللہ بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ الجون بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن سیدامام حسن بن امیرالمومنین علی ابن ابی طالب۔

بعض روایات میں آپ کا شجرہ نسب اس طرح بیان کیا ہے: شیخ عبدالقادر بن ابوصالح جنگی بن موسیٰ بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ الثانی بن عبداللہ الثانی بن موسیٰ الجون بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن سیدنا امام حسن امیرالمومنین علی ابن ابی طالب۔)

ان کے علاوہ بعضوں نے اس طرح بیان کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر ابو محمد ابن ابو صالح بن موسیٰ بن عبداللہ جیلی بن یحییٰ زاہد بن محمد داؤد بن موسیٰ بن عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن سیدنا امام حسن بن امیر المومنین علی ابن ابی طالب ؓ

آپ کے والد محترم جناب ابو صالح نہایت متقی۔ عابد و زاہد اور ایک پرہیزگار بزرگ تھے۔ گویا اسم بامسمیٰ۔ آپ کے تقوے اور دینداری کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی نہر میں بہتا ہوا ایک سیب آپ کے ہاتھ آگیا سیب نہایت خوش رنگ تھا طبیعت چاہی چنانچہ کھا لیا مگر کھاتے ہی معاً خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ یہ کس کے باغ کا سیب ہے باغبان کی اجازت کے بغیر کھانا "رکل حلال نہیں ہو سکتا چنانچہ اب نہر کے کنارے کنارے سیب کے مالک کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے کہ اس سے جا کر معافی مانگیں۔

جو بندہ یابندہ بالآخر ایک باغ میں پہنچ گئے اور وہاں آپ نے اس بات کا صحیح اندازہ لگا لیا کہ یہ سیب اسی باغ کا ہے اس باغ کے مالک جناب عبداللہ صومعی تھے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کر کے خواستگار معافی ہوئے۔

دل را دل می شناسد کے مصداق جناب صومعی نے دیکھا کہ ایک طرف عنفوان شباب ہے لیکن دوسری طرف تقوے طہارت کا یہ عالم ہے کہ طبیعت میں جوانی کی شوخی و شرارت مطلق نہیں۔ دل نے کہا یہ ضرور کسی عالی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔

جناب سید عبداللہ صومعی نے آپ کا حسب و نسب معلوم کیا بعد اطمینان کر لینے کے آپ کو اپنے پاس رکھا بعضوں نے لکھا ہے کہ آپ ان کی خدمت میں دس برس تک مقیم رہے اور باغبانی کرتے رہے۔

ایک روز جناب عبداللہ صومعی نے آپ سے فرمایا کہ آپ کو معافی اس شرط پر دی جا سکتی ہے کہ آپ میری اندھی اگونگی اپاہج اور بہری بیٹی کو اپنی بیوی بنانا قبول کر لیں۔ آپ نے منظور کر لیا چنانچہ شادی ہو گئی۔

حجلہ عروسی میں گئے وہاں اپنے گمان وخیال کے برعکس پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ نہایت حسین وجمیل عورت ہے اور اس کے تمام اعضا صحیح وسالم ہیں۔ سخت پریشانی ہوئی قریب تھا کہ کسی الجھن میں پڑ جاتے کہ آپ کے خسر نامدار نے اسے رفع کر دیا فرمایا ہاں یہی تمہاری بیوی ہے میں نے جو کچھ کہا تھا وہ درست ہے میرا اس سے مطلب ان باتوں سے تھا جو احکام الہٰی کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میری بیٹی ایسی تربیت یافتہ ہے کہ کبھی شیطان کے بہکائے بہک نہیں سکتی۔

یہ بی بی جناب فاطمہ ام الخیر تھیں جن کے آغوش امومت میں جناب سید عبدالقادر جیلانی نے پرورش وتربیت پائی آپ جناب امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے تھیں آپکا شجرہ نسب یوں ہے۔ سیدہ ام الخیر بی بی فاطمہ بنت سید عبداللہ صومعی بن ابوجمال بن محمد بن محمود بن ابوالعطاء عبداللہ بن کمال الدین عیسٰی بن ابوعلاؤالدین محمد الجواد بن علی الرضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام باقر بن امام زین العابدین بن سیدنا امام حسین ابن امیرالمومنین علی ابن ابی طالب۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ امۃ الخیر بی بی فاطمہ جب ساٹھ برس کی عمر کو پہنچیں تب آپ کے بڑھاپے اور عالم یاس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں اولاد کا منہ دیکھنا کسی طرح معجزے سے کم نہیں۔ آپ کے عادات وخصائل کے بارے میں لکھا ہے کہ عام بچوں سے بالکل مختلف تھے یعنی عالم طفلی میں بھی دودھ کے لیے کبھی روتے تھے نہ چلاتے تھے۔ کسی نے پلا دیا۔ پی لیا ورنہ چپ رہے اور گہوارے میں پڑے ہاتھ پیر چلاتے رہے۔

ابھی ہوش نہ سنبھالنے پائے تھے کہ والد محترم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے نانا جناب عبداللہ صومعی حیات تھے۔ اب وہی آپ کے سرپرست بنے۔ نانا کا چونکہ اپنا کوئی فرزند نہیں تھا۔ اس سبب انہوں نے آپ ہی کو فرزند بنا لیا اور تمام جائیداد آپ کے نام

وقف کر دی۔

جب آپ چار پانچ برس کے ہوئے تو بی بی فاطمہ نے آپ کو مکتب میں بٹھا دیا۔ دس بارہ برس کی عمر تک اسی مدرسے میں تعلیم پاتے رہے اسی دوران میں آپ کے نانا جناب سید عبداللہ صومعی کو بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے بلاوا آ گیا اب لے دے کر صرف آپ کی والدہ محترمہ بی بی فاطمہ ہی تھیں جن کے کندھوں پر تمام گھر کے انتظام کا بار تھا اور ان کی امیدوں کا واحد مرکز آپ تھے۔

بی بی فاطمہ اٹھتر برس کی تھیں کہ آپ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بغداد جانے کی خواہش پیش کی۔ ظاہر ہے کہ ایسے عالم میں بی بی فاطمہ کے دل پر کیا گزری ہو گی مگر فرمان نبوی کے پیش نظر کہ اطلب العلم ولو کان بالصین۔ تم علم سیکھو خواہ اس کے لیے تمہیں چین جانا پڑے بی بی نے آپ کو باچشم گریاں اجازت دے دی۔ اور فرمایا تمہارے بابا نے اسّی دینار ترکہ میں چھوڑے تھے۔ ان میں سے چالیس دینار تم لے جاؤ اور چالیس دینار تمہارے بھائی کے لیے رکھ لیتی ہوں۔ آپ بغداد پہنچ کر سلطان نظام الملک کے مدرسہ عالیہ نظامیہ بغداد میں داخل ہوئے علامہ شیخ ابوسعید اس مدرسہ کے مہتمم تھے آپ نے جناب شیخ سے درس قرآن حکیم حاصل کیا پھر قواعد تجوید۔ علم تفسیر۔ فقہ اور اصول حدیث کی تعلیم پائی۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ علوم عقلی و نقلی میں ایک متبحر عالم ہو گئے۔

آپ کے بزرگ استاد جناب شیخ نے تکمیل تعلیم کے بعد آپ سے اسی مدرسہ میں طلبا کو تعلیم دینے پر اصرار کیا الامر فوق الادب کے پیش نظر آپ نے استاد کے حکم کی تعمیل کی اور اسی مدرسہ نظامیہ بغداد میں طلباء کو تعلیم دینے لگے۔

درس و تدریس کا جو انداز قدرت نے آپ کو عطا کیا تھا وہ آپ کے زمانے کے کسی مدرس یا معلم کو حاصل نہ تھا۔ حاصل کلام یہ کہ آپ ایک تھوڑی ہی مدت میں عالم متبحر و عارف کامل کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔

آپ کی ذہانت و فطانت کا عالم یہ تھا کہ مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق مسئلہ جو بڑے بڑے علماء سے حل نہ ہوتا تھا ایک ثانیہ کی مہلت میں حل کر کے رکھ دیتے تھے۔

مختصر اً یہ کہ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ نے علوم باطنی کی تحصیل کے لیے اپنے استاد علامہ شیخ ابوسعید مبارک بن علی مخزومی کے مرید ہوئے۔ مخزومی شیخ ابوالحسن علی بن محمد القرشی کے مرید تھے۔ ابوالحسن شیخ ابوالفرح طرطوسی کے مرید تھے۔ طرطوسی۔ ابوالفضل عبدالواحد تمیمی کے مرید تھے۔ تمیمی شیخ ابوبکر شبلی کے مرید تھے۔ شبلی شیخ جنید بغدادی کے مرید تھے۔ بغدادی اپنے ماموں شیخ سر سقطی کے مرید تھے۔ سقطی شیخ معروف کرخی کے مرید تھے کرخی شیخ داؤد طائی کے مرید تھے۔ طائی شیخ حبیب عجمی کے مرید تھے عجمی خواجہ حسن بصری کے مرید تھے۔ بصری امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کے مرید و شاگرد تھے۔

آپ سے طریقت کا جو سلسلہ آگے چلا وہ آپ ہی کے نام نامی پر سلسلۂ قادریہ سے موسوم ہوا۔ آپ کی بزرگی اور علمی فضیلت و شخصی کمال کے اعتراف کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو گی۔ کہ طریقت کے تمام سلسلوں میں آپ کا فیض جاری ہے اور بلا استثناء طریقت کے تمام سلسلے کے بزرگوں نے آپ کو اولیائے کبار کی فہرست میں سب سے افضل تسلیم کیا ہے۔

پچیس برس کا سن جوانی کی شوخیوں کا زمانہ ہوتا ہے آپ نے اس عمر میں پہنچ کر بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیئے اور نفس کی ہر اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا جس سے انسان کے دل میں دنیا سے رغبت پیدا ہوتی ہے اور وہ دنیا ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب جناب جیلانی پچاس برس کے ہوئے تو آپ نے جامع بغداد میں وعظ کہنا شروع کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو ایسی بلند آواز عطا فرمائی کہ دور و نزدیک ہر جگہ سے یکساں سنائی دیتی تھی۔

اور یہ بھی آپ کے بیان ترجمان قرآن کا اثر تھا کہ لوگ وعظ سنتے سنتے مبہوت ہو جاتے اور مجمع کا یہ عالم ہوتا کہ جامع مسجد میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہتی بڑے

بڑے علماء مشائخ آپ کے وعظ میں شریک ہوتے اور گوش ہوش وا کرتے۔ کہتے ہیں چار سو علماء آپ کے وعظ میں اس لیے شریک ہوتے کہ آپ کے ارشادات قلمبند کریں۔ اور کتنے ہی یہودی اور عیسائی آتے کہ آپ کی زبان ترجمان قرآن سے وعظ سن کر مسلمان ہو جاتے۔ لکھا ہے کہ آپ کے دستِ حق پرست پر پانسو سے زیادہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔

اصلاح احوال کا جو اسلوب آپ نے اختیار کیا وہ آپ کے زمانے میں کسی کو میسر نہیں تھا۔ اخلاق سنوارنے اور بگڑے ہوئے لوگوں کے احوال سدھارنے میں بڑی سے بڑی حکومت بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مگر آپ کی ایک ہی نگہہ التفات بڑے بڑے سرکشوں۔ ڈاکوؤں رہزنوں اور چوروں پر وہ کام کر گئی۔ ان کے دل و دماغ کو ایسا مسلمان کیا۔ فکر و نظر میں ایسی جِلا پیدا کی کہ انہوں نے سیدھی راہ کو چھوڑ کر پھر کبھی گمراہی کا راستہ اختیار نہ کیا اس سلسلے میں ایک ادنیٰ سی مثال آپ کے بچپن کے زمانے کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب آپ مرتبہ ولایت پر پہنچے تب اس وقت آپ کی زبان ترجمان قرآن میں کیا اثر تھا اور آپ کس شان کے بزرگ تھے۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ چودہ برس کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک قافلہ کے ساتھ بغداد کو روانہ ہوئے والدہ محترمہ نے آپ کی گدڑی میں چالیس اشرفیاں رکھ کر اس مقصد کے لیے سی دیں کہ حفاظت رہے اور ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ بدقسمتی سے راستے میں ڈاکہ پڑا۔ جو شئے جس کے ہاتھ آئی ڈاکوؤں نے اس سے بڑی بے دردی سے چھین لی۔

ڈاکوؤں نے آپ سے پوچھا۔ تمہارے پاس کیا ہے؟ آپ نے کہا چالیس اشرفیاں ڈاکو سمجھے آپ نے ہم سے مذاق کیا ہے۔ چنانچہ آپ کو اپنے سردار احمد الفی کے پاس لے گئے اور ماجرا بیان کیا۔ سردار نے بھی آپ سے یہی پوچھا اور آپ نے اسے بھی یہی جواب

دیا۔ اس نے کہا اچھا لاؤ دکھاؤ تو وہ چالیس اشرفیاں کہاں ہیں۔ آپ نے گدڑی ادھیڑی اور اشرفیاں نکال کے ان کے سامنے رکھ دیں۔

ڈاکو بہت حیران ہوئے۔ سردار نے کہا اے لڑکے تو نے ایسی چھپی ہوئی چیز جو ہزار کوششوں کے باوجود بھی ہمارے ہاتھ نہ آسکتی تھی کیوں ظاہر کر دی آپ نے جواب دیا میں تعلیم کی غرض سے بغداد جا رہا ہوں یہ اشرفیاں میری والدہ نے سفر کے خرچ کیلئے میری گدڑی میں رکھی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بڑی شدت سے تاکید کی کہ سچ کو کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ ہمیشہ سچ بولنا۔ ڈاکوؤں کے دل پر آپ کی بات نے کچھ ایسا اثر کیا کہ فوراً ڈکیتی سے توبہ کر کے پارسائی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ یہ لوگ چوروں اور ڈاکوؤں کی صف سے نکل کر اللہ کے دوستوں میں شمار ہوئے

احکام شریعت کی پابندی اور اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت بچپن ہی سے آپ کے دل میں جاگزیں تھی جب تحصیل علم سے فارغ ہو کر آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عارف عظیم المرتبت ولی اللہ ہوئے تو اس وقت بھی آپ کا یہ عالم تھا کہ سلام کرنے میں پہل فرماتے تھے۔

چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور بڑوں کی تعظیم کرتے۔ کمزوروں، ضعیفوں، غریبوں اور حاجتمندوں کی دستگیری فرماتے ان کی ضرورتیں پوری کرتے لیکن کسی دولتمند یا امیر اور رئیس کو کبھی خاطر میں نہ لاتے اور نہ کبھی اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے۔

غریبوں کے گھر پر اکثر خود چل کر جاتے اور ان کی مزاج پرسی کرتے لیکن کسی دولت مند کے دروازے پر کبھی قدم نہ رکھتے۔ بادشاہ وقت سے لیکر تمام اراکین حکومت تک کبھی کسی کی پرواہ نہ کرتے۔

اگر کسی ضرورت مند و محتاج دبے ہوا کے بارے میں کسی حاکم سے کچھ کہنا ہوتا تو اسے سفارش کے طور پر لجاجت کے ساتھ نہ لکھتے نہ کہتے بلکہ تحکمانہ انداز میں فرمان لکھتے اور حکم دیتے

کہ اس کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور اس کی بات سنی جائے۔

صاحب طبقات نے لکھا ہے کہ آپ نے ۵۲۰ ہجری میں وعظ کہنا شروع کیا۔ تمام اراکین حکومت آپ کے وعظ میں شریک ہوتے اور آپ کی تنقید حکومت پر اتنی سخت ہوتی کہ کسی کی مجال نہیں تھی جو آپ کے بیان پر ذرا گرفت کر سکے۔ اکثر دس دس اور بیس بیس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ مگر کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ آپ کے سامنے لب کشائی کر سکے۔

آپ کے وعظ کا ماحصل یہ تھا۔ کہ اے لوگو اللہ اور اللہ کے رسول کی پیروی کرو اس کے احکام پر صدق دل سے عمل کرو۔ دین میں کوئی نئی بات نہ پیدا کرو۔ خدا کی نافرمانی مت کرو صبر کرو بے صبر نہ ہو۔ کشائش کا انتظار کرنا چاہیے۔ ناامید نہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر سب ایک ہو جاؤ۔ اور آپس میں نااتفاقی پیدا نہ کرو۔ توبہ کر کے گناہوں سے پاک ہو جاؤ۔ ان سے آلودہ نہ ہو جاؤ اور اپنے مولا کے دروازے سے نہ ہٹو۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جب میں فرائض کے بعد اچھے کاموں پر غور کرتا ہوں تو محتاجوں اور مہمانوں کو کھانا کھلانے اور عام وخاص کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے اور دشواریوں میں ہاتھ بٹانے سے بہتر کسی کام کو نہیں پاتا۔ اگر دنیا کی تمام دولتوں کے خزانے مجھے مل جاتے تو میں سب کے سب فقیروں اور مسکینوں پر خرچ کر دیتا۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کو کھلا دیتا یہ ہیں وہ درحقیقت آپ کے نیک خیالات وعزائم جن کی وجہ سے آپ کو پیر دستگیر غریبوں کا ہاتھ پکڑنے والا اور غوث الاعظم کہا جاتا ہے۔ یعنی اولاد آدم میں سے غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے والا سب سے بڑا انسان آپ کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ آپ اپنے شاگردوں اور مہمانوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھاتے۔ غریبوں اور مسکینوں میں بیٹھ کر تو آپ کو بے پناہ مسرت ہوتی۔ آپ فرمایا کرتے کہ امیروں اور دولتمندوں کے ساتھ بیٹھنے کی آرزو تو ہر شخص کرتا ہے لیکن حقیقی سعادت ومسرت انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کو مسکینوں اور غریبوں کی ہم نشینی کی آرزو رہتی ہے۔

آپ کا یہ قاعدہ تھا کہ مریدین ومعتقدین جو تحفے تحائف اور بڑی بڑی رقمیں نذرانے

کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کرتے۔ وہ اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دیتے ایک موقع پر آپ خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں روپیہ پیسہ مال و دولت مطلق نہیں ٹھہرتا۔ اگر صبح میرے پاس ہزار دینار آئیں تو شام تک ان میں سے ایک بھی دینار باقی نہ رہے آپ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم سمجھتے۔ آپ کے دروازے سے کبھی کوئی سائل خالی نہیں گیا۔ اگر آپ کے پاس کسی وقت رقم نہ ہوتی تو سائل کو اپنے تن کے کپڑے اتار کر دے دیتے۔ مخدوم جہانیاں گشت کہتے ہیں کہ آپ بعض اوقات سو سو غلام خریدتے اور اسی وقت انہیں آزاد کر دیتے تھے۔

خیر یہ تو شان آپ کے جمال کے پہلو کی تھی۔ اب ذرا شان جلال دیکھئے کہتے ہیں ایک مرتبہ خلیفہ بغداد المقتضی نے ابن مرجم کو جو ظالم کے نام سے مشہور تھا۔ شہر کا قاضی مقرر کیا۔ اس کے عہدہ قضا پر تقرر سے لوگوں میں سخت بے اطمینانی و تشویش پھیل گئی۔ لوگوں نے آپ کی خدمت میں شکایت کی۔ اس پر آپ نے بر سر منبر خلیفہ بغداد سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو قاضی (منصف یا جج) مقرر کیا ہے جو سخت ظالم ہے۔ کل جب تم اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں پہنچو گے تو اس وقت اللہ کو کیا جواب دو گے؟ وہ تو اپنے بندوں پر نہایت مہربان اور شفیق ہے۔" کہتے ہیں خلیفہ آپ کے یہ کلمات سن کر لرزنے لگا اور اس نے فوراً ہی ابن مرجم کو قضا کے عہدے سے علیحدہ کر دیا۔

ایک مرتبہ آپ مسجد میں بیٹھے وعظ کہہ رہے تھے کہ اسی دوران میں آپ کو چھینک آئی آپ نے الحمد اللہ کہا۔ لوگوں نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ یرحمک اللہ کہا تو مسجد لوگوں کی مجمع آواز سے گونج اٹھی۔ خلیفہ بغداد نے جو اس وقت وہاں موجود تھا حیرت سے پوچھا یہ کیا ہوا؟ اسے جواب ملا کہ سیدنا عبدالقادر جیلانی کو چھینک آئی ہے لوگ اس کا جواب دے رہے ہیں اس پر خلیفہ بغداد نے اصل میں حکومت تو یہ ہے۔

دلوں پر حکومت دلوں کو موہ لینے سے قائم ہوتی ہے۔ دل کا موہ لینا ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے ؎ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔ صد ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

آپ کو ایک زمانہ پیر دستگیر اور غوث الاعظم و محبوب صمدانی و سبحانی وغیرہ ناموں سے جو یاد کرتا ہے ہر چند اس میں بشریت کا پہلو نمایاں ہے۔ تاہم یہ اسی جذبے کی ایک صورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے دل غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں سے محبت کرنے کے لئے پیدا کیا۔

ایک مرتبہ طالب علمی کے زمانے میں آپ کو سامان خورد و نوش کی سخت دشواری پیش آئی۔ ایک پھوٹی کوڑی پلے نہیں تھی۔ مگر بھوک کے مارے سخت بُرا حال ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص بھنا ہوا گوشت اور تازہ تازہ روٹیاں لے کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے ان کا جو یہ حال دیکھا تو نہایت اصرار کر کے کھانے پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں آپ نے کہا تعلیم پا رہا ہوں اس نے کہا گیلان سے بھی ایک نوجوان عبد القادر حصول تعلیم کے لیے یہاں بغداد آیا ہوا ہے کیا تم اسے جانتے ہو؟ آپ نے کہا۔ جی ہاں وہ میں ہی ہوں۔ اس جواب پر وہ شخص سخت بے چین اور آبدیدہ ہو کر بولا۔ بھائی تم میرے مہمان نہیں بلکہ اب میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہاری والدہ نے تمہارے خرچ کے لیے آٹھ دینار دیئے تھے کہ تمہیں پہنچا دوں مگر مجھ سے تمہاری امانت میں خیانت ہو گئی۔ آپ نہایت صبر و اطمینان کے ساتھ خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے پھر وہ کہنے لگا، ہوا یوں کہ میں نے آپ کو بغداد میں بہت ڈھونڈا کئی دن آپ کی تلاش میں لگ گئے اس مدت میں میرا ذاتی خرچ جو میں اپنے ساتھ لایا تھا ختم ہو گیا۔ جب لگا بھوکوں مرنے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا تو میں نے آج یہ رقم صرف کر کے کھانا خرید لیا۔ جسے ابھی ابھی ہم دونوں نے مل کر کھایا ہے۔

آپ نے یہ تمام بات سن کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے حسن خیال و نیت کی تعریف کی اور اسے تسلی دی۔ اس کے بعد کچھ بچا ہوا کھانا دے کر اسے نہایت محبت کے ساتھ رخصت کیا۔

آٹھ دینار اور قحط کے ایام پر غور کیجیے ان دنوں اس تھوڑی سی رقم کی کتنی بڑی اہمیت ہو گی۔ لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اسے بخش دیئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ان اللہ مع الصابرین اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ قحط کی ہولناکی کے انہی دنوں میں آپ نے بھوکے ننگے فقیروں کی ایک جماعت کو دیکھا کہ شدید فاقہ کشی میں زندگی

دعوت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کی طبیعت میں بے حد ملال پیدا ہوا۔ پروردگار سے دعا کی اور اس نے فوراً قبول کی کہ ان فقیروں کا حال سے متاثر ہو کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک شخص ملا۔ اور اس نے سونے کا ایک ٹکڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ یہ ٹکڑا آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کے اخراجات کے لیے بھیجا ہے۔ آپ بازار گئے بقدرِ ضرورت سونا فروخت کیا اس سے جو دام میسر آئے ان سے سب سے پہلے فقیروں کی فاقہ کشی دور کی۔

آپ کے زمانہ ولایت میں بغداد مذہبی و سیاسی بحرانی میں مبتلا تھا۔ مذہب کا حال تو یہ تھا کہ دین کے نام پر طرح طرح کے فرقے اور گروہ بن چکے تھے اور ان کے عقائد میں ایسی ایسی باتیں داخل ہو چکی تھیں کہ ان کا دین اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ خاص کر اسمٰعیلی فرقے کی باطنی تحریک نے تو خوب ہی اودھم مچا رکھا تھا۔ دوسری طرف خلفائے عباسیہ کا ستارہ اقبال زوال پذیر تھا۔ ان کی حیثیت خلافت کے تخت پر مذہبی پیشواؤں سے زیادہ نہیں تھی۔ حالات یہ تھے کہ سلاطین سلاجقہ آپس میں لڑ رہے تھے اور ان میں سے جس کی قوت زیادہ ہو جاتی اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا اور بغداد میں اس کے خلاف کسی میں دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

ان احوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنانِ اسلام نے سر اٹھایا اور میدان کارزار گرم کیا۔ تمام عیسائیوں نے متحد ہو کر عالم اسلام پر یلغار کر دی۔ تاریخ اسلام یہ لڑائی پہلی جنگ صلیبی کے نام سے مشہور ہے اب ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ اپنوں اپنوں میں اقتدار و حکومت کے لیے تلوار چل رہی ہے کہیں ایک دوسرے کے خلاف مذہب کی آڑ لیکر طرح طرح کی غیر اسلامی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں جن میں اسمٰعیلی شیعوں کی تحریک باطنیت سر فہرست ہے اور دوسری طرف اسلام کو مٹانے کے لیے کفر و باطل کی تمام قوتیں مجتمع ہو کر مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئیں۔ اب ان حالات میں کسی قوم میں خواہ کتنی ہی قوت، عزم و جوش اور ولولہ جہاد کیوں نہ ہو وہ جب تک متحد نہیں ہوتی سب کا مرکز ایک نہیں ہوتا۔ اس کا وجود و عدم دونوں برابر ہیں۔

کسی قوم کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے اور ان کے آپس کے اختلافات کو دبانے کے لیے ایک

ایسی تبلیغ سے بڑھکر کوئی ایسا موثر ذریعہ نہیں ہو سکتا جس میں فروعی اختلافات سے قطع نظر صرف اصولوں پر زور دیا جائے۔

آپ نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا تو اس میں اپنی ذات کو مرکز نہیں بنایا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر تمام مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش فرمائی حکومت و اقتدار کے لیے دین و مذہب کے نام پر مسلمانوں میں جو مختلف گروہ بن چکے تھے ان کے اغراض و مقاصد کی نقاب کشائی کی۔

آپ نے اپنے جد امجد جناب سیدنا امام حسن کا اخلاق و کردار ہر مرحلے اور زندگی کے ہر گام پر پیش نظر رکھا یعنی امام حسن نے دیکھا کہ ان کے رفقا وقت پر ساتھ نہیں دیں گے اور خلافت سے علیحدگی پر خون کی ندیاں بہنے سے رُک سکتی ہیں چنانچہ آپ علیحدہ ہو گئے اور اس طرح آپ نے مسلمانوں کو باہمی کشت و خون اور جنگ و جدل سے بچا لیا۔

جناب امام حسین بیوی بچوں اور جاں نثاروں کو ساتھ لے کر گھر سے چلے تھے تو آپ نے کسی سے لڑنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا۔ کوفے والوں کے خط پر خط آ رہے تھے یہ ان کی دعوت پر کوفہ کو روانہ ہوئے کوفہ پہنچ کر آپ کو جو حالات پیش آئے۔ لوگوں نے سرد مہری سے کام لیا اس وقت بھی آپ نے کسی سے جنگ و جدل کرنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ یہ کیا کہ واپس جانے کی خواہش ظاہر فرمائی یا کہا کہ مجھے یزید سے مل کر اپنا معاملہ طے کر لینے کی مہلت دی جائے اور اگر یہ گوارا نہ ہو تو کسی مہم پر بھیج دیا جائے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کی اجازت ہو۔ یہ باتیں آپ نے کیوں کہیں؟ صرف یہ کہ محمد رسول اللہ کی امت میں آپؐ کے نواسے کے لیے باہمی تلوار نہ چلے۔

آپ نے اپنے دادا جناب حسن اور نانا جناب حسین کے اخلاق مطہرہ کی پوری پوری پیروی کی۔ آپ نے اپنے وعظ میں اسلام کے صرف اصولوں کی تبلیغ کی۔ اور حکومت و سیاست کے معاملات میں قطعاً اپنے آپ کو نہیں الجھایا۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے لاکھوں انسانوں کے دلوں پر مکمل حکمرانی کی اور ایسی حکمرانی کہ تخت و تاج کے مالکوں کو رشک آتا تھا۔ آپ کے پُر

اخلاص ارشادات ولنصائح نے جن کی اثر انگیزی کے مقابلے میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہیچ ہیں مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹ جانے سے بچا لیا یہی وہ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کے سبب سے اسلامی دنیا آپ کو محی الدین (دین کو زندہ کرنے والا) کے لقب سے یاد کرتی ہے اور یہی وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جس کے ادا کرنے پر آپ کا مرتبہ بلند ہوا کہ تمام اولیائے کرام آپ کے قدموں میں سر دیتے ہیں اور آپ کے طریقے میں داخل ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہندوستان میں آپ کا سلسلۂ قادریہ سلطان سکندر خاں لودھی کے عہد حکومت میں جناب سید محمد غوث گیلانی سے پھیلا۔ جناب غوث نو واسطوں سے اپنے جدّ امجد جناب سید عبدالقادر جیلانی سے جا ملتے ہیں۔

جناب غوث علاقہ اوچھ ضلع ملتان کے قریب ۸۲۴ھ میں مقیم ہوئے۔ آپ کے زمانے میں ہندوستان کی مذہبی فضا کو ہموار کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور اس کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے معتقدات کو باہم ملا جلا کر ایک ایسا گروہ پیدا کیا جا رہا تھا جس کی تعلیمات میں دونوں گروہوں کے اعتقادات و مذہب کا رنگ موجود تھا۔ بھگت کبیر جو ۸۴۴ھ میں پیدا ہوئے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تحریک اتحاد بھگتی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔

تحریک تصوف کی تاریخ میں بھگتی تحریک کو اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستانی خیالات و معتقدات مشاغل اور یوگ کے طریقے یعنی حبس دم وغیرہ صوفیوں میں راہ پا گئے۔ قادری سلسلے نے تصوف اسلامی سے ان تمام باتوں کو جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں کلی طور پر نکال باہر کیا۔

تصانیف دین اسلام کی حفاظت و مدافعت کے لیے جناب جیلانی علیہ الرحمہ نے جو کتابیں تصنیف کیں ان کی حیثیت بجا طور پر حصار دین و فصیل ملّت کی ہے آپ کی سب سے پہلی کتاب غنیۃ الطالبین ہے۔ اس میں احکام شرع بیان کئے گئے ہیں اور

انکی توضیح بھی کی گئی ہے اس کے علاوہ دیگر مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے دوسری کتاب فتوح الغیب ہے جس میں آپ نے مضامین تصوف نہایت عالمانہ انداز میں پیش کیئے ہیں تیسری کتاب فتح ربانی ہے جس میں آپ کے مواعظ حسنہ و خطبات عالیہ ملتے ہیں۔ انہیں آپ کے نواسے جناب سید عفیف الدین مبارک نے مرتب کیا ہے۔

مکتوبات سبحانی اس میں آپ کے وہ خطوط جمع کیئے گئے ہیں جو آپ نے وقتاً فوقتاً پند و نصائح کی غرض سے مختلف لوگوں کو لکھے تھے **قصائد** اس میں آپ کے پُردرد چودہ قصیدہ ہیں اس کے علاوہ آپ کا ایک فارسی دیوان ہے منجملہ ان کے آپ کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن میں زیادہ زمشہور رہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

ازواج واولاد آپ نے مختلف اوقات میں چار شادیاں کیں جن سے کل بیس لڑکے اور انتیس لڑکیاں پیدا ہوئیں آپ نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائی جس سے آپ کی اولاد نے علم و فضل کی دنیا میں بڑا نام پایا ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں

۱ - شیخ سیف الدین عبدالوہاب
۲ - شیخ عبدالرزاق تاج الدین
۳ - شیخ شرف الدین عیسیٰ
۴ - شیخ ابواسحاق ابراہیم
۵ - شیخ ابوبکر عبدالعزیز
۶ - شیخ یحییٰ
۷ - شیخ عبدالجبار
۸ - شیخ محمد موسیٰ
۹ - شیخ محمد

خدام وخلفا سلسلہ قادریہ کے خدام خلفا کی تعداد یوں تو ہزاروں تک پہنچتی ہے مگر ان میں سے جن کو اسلام کے پھیلانے میں شہرت دوام حاصل ہوئی ان میں سے چند ایک مشاہیر کرام کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ شیخ ابوالبقا ابوالحسن علی ۲ - مفتی عراق قاضی ابوطالب عبدالرحمٰن - ۳ - شیخ امام موفق الدین - ۴ - قاضی ابوالعباس احمد

۵۔ شیخ ابومحمد عبداللہ بن خشاب۔ ۶۔ شیخ قاضی ابو یعلی۔ ۷۔ شیخ ابوالسعود احمد بن ابی بکر حریمی عطار ۸۔ علامہ ابوبکر عبداللہ بن نصر۔ ۹۔ شیخ شہاب الدین سہروردی ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے بزرگ ہیں جن کو آپ کے سلسلے سے فیض حاصل ہوا ہے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ اپنے مریدین و خلفاء کو ممالک اسلامیہ میں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور دوسرے شہروں میں اسلام کی تبلیغ کے روانہ کرتے اور چلتے وقت انہیں حسب ذیل ہدایات فرماتے۔

۱۔ حاکموں اور امیروں کی ملازمت نہ کرنا۔

۲۔ کسی امیر سے وظیفہ نہ لینا۔

۳۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کی مکمل پیروی کرنا

۴۔ شریعت کی حدود سے کبھی آگے نہ بڑھنا۔

۵۔ زندگی نہایت سادگی سے بسر کرنے کو اپنا شعار بنانا۔

وفات

تبلیغ اسلام اور مدافعت دین کے لیے آپ نے ۵۲۱ھ میں وعظ کہنا شروع کیا جو ۵۶۱ھ یعنی آپ کے انتقال تک چالیس برس برابر جاری رہا اس مدت میں سینکڑوں یہودیوں اور عیسائیوں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا ہزاروں مسلمانوں کے ایمان کی تجدید اور عقائد کی اصلاح ہوئی بہت سے شاگرد پیدا کیے جو مشاہیر کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں کئی جماعتیں دیگر ممالک میں اسلام کو پھیلانے کے لیے تیار کیں۔ موصل حلب دمشق۔ تبریز۔ ہمدان۔ طوس۔ بسطام۔ الخطیف اور کوفہ وغیرہ میں قادری سلسلے کے مدرسے قائم ہوئے غرض احیائے اسلام و تبلیغ دین میں کوشش کرتے جب آپ اکیانوے برس کے ہوئے اور آپ کی تمام کوشش بار آور ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ میں اس دنیائے فانی سے آپ کو واپس بلا لیا آپ ۵۶۱ھ میں چند روز صاحب فراش رہ کر راہی دارالبقا ہوئے آپ نے بغداد میں وفات پائی وہیں آپ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے

اقوال

۱۔ مالدار بننے کی آرزو نہ کرو، بوالہوس مت بنو مالدار اور فقیر و بے نوا کے درمیان امتیاز مت رکھو۔

۲ ۔ عمل کے بغیر علم مطلق فائدہ نہیں پہنچاتا عامل بنو جان بوجھ کر جاہل نہ بنو۔ عالم باعمل نائب خدا ہے ۔

۳ ۔ اپنے جائز کسب سے کماؤ۔ دین کے ذریعے سے ہرگز نہ کماؤ۔ جائز کماؤ اور کھاؤ اور اس سے دوسروں کی غمخواری بھی کرو۔

۴ ۔ اللہ سے بندوں کا شکوہ نہ کرو۔ جب تک زندگی کا دروازہ کھلا ہے اسے غنیمت جانو۔

۵ ۔ ایمان والوں کی آزمائش ہوتی ہے۔

۶۔ خدمت کرو مخدوم بن جاؤ گے۔

۷۔ افسوس اس شخص پر جس نے قرآن تو حفظ کیا مگر اس پر عمل نہ کیا۔

۸۔ باطن کا جہاد ظاہر کے جہاد سے زیادہ سخت ہے۔

۹۔ دنیا تمہارے ہاتھ میں تو رہے مگر دل پر اس کا قبضہ نہ ہونے پائے۔ دل کو اللہ کی یاد سے آباد کرو۔ اللہ ہی کی محبت کا تمہارے دل پر قبضہ ہو۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ

ولادت ۵۲۹ھ سیستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب خواجہ سید غیاث الدین ایک خدا رسیدہ اور صاحب اثر و دولت بزرگ تھے۔

آپ کے زمانے میں غز ترکوں نے سلجوقی بادشاہ سلطان سنجر پر حملہ کیا۔ سیستان کا حاکم سنجر کی طرف سے بڑی بے جگری سے لڑا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ غز ترکوں کے ہاتھ زندہ گرفتار ہوا۔ سلطان سنجر نے راہ فرار اختیار کی۔

غز ترکوں کے حملے سے سیستان میں جو تباہی و بدنظمی پھیلی اس نے خواجہ غیاث الدین کو دل برداشتہ کر دیا۔ وہ سیستان کو چھوڑ کر خراسان آ گئے۔ جہاں خواجہ معین الدین کی ابتدائی نشو و نما ہوئی۔

۵۴۹ھ میں جب خواجہ معین الدین بمشکل تیرہ برس کے ہوں گے۔ انہوں نے غز ترکوں کی ہولناکیوں اور تباہیوں کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سلطان سنجر کو غز ترکوں کے مقابلے میں دوبارہ شکست ہوئی۔ اور وہ ان کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ اب سیستان کو بے دست و پا کر کے ترکوں نے جو آفت مچائی۔ خدا کی پناہ ایک ایک کر کے تمام بڑے بڑے آدمی قتل کر دیے گئے جن میں علماء، فضلاء، شیوخ اور شہر کے دولت مند لوگ شامل تھے۔ عورتوں کی عصمت لوٹی گئی۔ مسجدوں کو ویران کیا گیا۔ ان واقعات نے خواجہ معین الدین کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ دنیا سے یکسر بیزار ہو گئے۔

۱۱۵۵ھ میں کہ جب خواجہ معین الدین پندرہ برس کے تھے۔ آپ کے والد محترم انتقال کر گئے۔ معلوم نہیں آپ کل کتنے بہن بھائی تھے۔ مگر ترکے کی تقسیم سے پتہ چلتا ہے کہ دو چار ضرور ہوں گے۔ باپ کے ترکہ سے آپ کے حصے میں ایک باغ اور چکی ملی تھی۔ جس کو آپ نے اپنی روزی کا ذریعہ بنایا یعنی آپ خود ہی باغ کی دیکھ بھال کرتے۔ پانی پہنچاتے اور خود ہی فصل کاٹتے تھے۔

ایک روز اپنے باغ میں درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے ایک عارف کامل اور صاحب علم و عمل بزرگ کا گزر ہوا۔ آپ نے ان کی بڑی تعظیم کی۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے لا کے بٹھایا۔ اور ایک تازہ انگوروں کے خوشہ سے تواضع کی۔ اور نہایت ادب کے ساتھ زانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ یہ بزرگ ابراہیم قندوزی تھے۔ انہوں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان اپنے دل میں حقیقت کو پانے کا جذبہ رکھتا ہے۔ ع

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ابراھیم قندوزی کی ملاقات نے خواجہ معین الدین کے دل پر بہت گہرا اثر کیا۔ آپ نے باغ اور چکی فروخت کر کے اس کی رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی۔ اور حق کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔

خواجہ خراسان سے چل کر سمرقند و بخارا آئے۔ یہاں آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا تفسیر حدیث و فقہ اور دوسرے علوم دین میں تکمیل حاصل کی۔ اور اس کے بعد نیشاپور کے ایک قصبے ہارون میں آگئے۔ یہاں ایک خدا رسیدہ صاحب علم و تقوےٰ بزرگ شیخ عثمان ہارون تشریف رکھتے تھے۔ اور ایک خلق خدا ان کے فیوض علمی سے فیض پا رہی تھی۔ خواجہ معین الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مرید ہو گئے۔

شیخ عثمان ہارونی تصوف میں چشتی سلسلے کے بزرگ تھے۔ ان کی طریقت کا سلسلہ یوں ہے کہ شیخ عثمان ہارونی چشتی جناب شیخ زندنی چشتی کے مرید تھے۔ زندنی جناب خواجہ مودود چشتی

کے مرید تھے۔ مودود چشتی، خواجہ ناصر الدین چشتی کے مرید تھے۔ جناب ناصر چشتی، خواجہ محمد اسحاق بانیٔ سلسلہ چشت کے مرید تھے۔ خواجہ محمد اسحاق چونکہ خراسان کے اطراف میں چشت نام ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اسی مناسبت سے چشتی کہلائے اور ان سے آگے جو ارادت مندی کا سلسلہ چلا یعنی جن بزرگوں نے ان کے ہاتھ پہ بیعت کی انہیں چشتی کہا گیا ہر چند جناب اسحاق شام کے رہنے والے تھے مگر ایک مدت سے یہاں آ رہے تھے اور یہاں برسوں رہ کر اپنے فیوض باطنی سے لوگوں کو فیض پہنچایا اور یہیں مدفون ہوئے اس لیے انہیں چشتی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ یہ بات خواجہ حسن بصری کے بیان میں پیش کی جا چکی ہے کہ تصوف کے کئی ایک سلسلے جو اس وقت رائج ہیں۔ خواجہ حسن بصری ہی کے واسطے سے جناب علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ چشتی سلسلہ کا شجرہ طریقت ملاحظہ فرمائیں

۱۔ خواجہ محمد اسحاق بانیٔ سلسلۂ چشت۔ خواجہ ممتاز دینوری کے مرید تھے۔ دینوری خواجہ ہبیرہ بصری کے مرید تھے۔ بصری خواجہ حذیفہ مرعشی کے مرید تھے۔ مرعشی سلطان ابراہیم ادھم کے مرید تھے۔ ادھم فضیل بن عیاض کے مرید تھے۔ عیاض عبدالوحد بن زید کے مرید تھے۔ زید حبیب عجمی کے مرید تھے۔ عجمی جناب خواجہ حسن بصری کے مرید تھے۔ اور حسن بصری جناب علی کرم وجہ اللہ کے شاگرد اور مرید تھے۔

پاک و ہند میں سلسلۂ چشت جناب خواجہ معین الدین چشتی سے پھیلا۔ یہاں نیچے جا کر چشتی سلسلے کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک چشتیہ نظامیہ، دوسرے چشتیہ صابریہ۔ خواجہ معین الدین اپنے پیر و مرشد سے خرقہ درویشی و سند ولایت حاصل کرنے کے بعد ۵۶۲ھ کے آخر میں بغداد آئے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین بغداد میں جناب سید عبدالقادر جیلانی سے ملے۔ لیکن یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جیلانیؒ ۵۶۱ھ ماہ ربیع الاول کے آخر میں عالم جاودانی کو سدھار چکے تھے۔

لکھا ہے کہ آپ نے شیخ یوسف ہمدانی سے ملاقات کی۔ مگر ہمدانی کا زمانہ بھی بہت پہلے کا ہے۔ وہ جناب عبدالقادر جیلانی کے ابتدائی زمانے میں ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ بیان بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ کہ خواجہ کی ہمدانی سے ملاقات ہوئی۔

بغداد میں جن بزرگوں نے خواجہ معین الدین چشتی سے اکتساب کیا اور ان سے فیض اٹھایا ان میں جناب شیخ داوٗد کرمانی اور شیخ الشیوخ جناب شہاب الدین عمر سہروردی کے نام نمایاں ہیں۔

بغداد سے پھر خواجہ نے ہمدان کی راہ لی۔ یہاں ٹھہرے کچھ دن قیام کر کے اور بزرگان دین کے فیوض باطنی سے فائدہ اٹھا کر پھر تبریز آ گئے۔ یہاں شیخ ابوسعید تبریزی سے ملے۔ یہ شیخ تبریزی بڑے خدارسیدہ اور عارف کامل بزرگ تھے۔ شیخ نظام دین محبوب الہی جیسے بلند مرتبہ بزرگ ان کی پارسائی و علمی فضیلت کے معترف تھے۔

تبریز کے بعد جناب خواجہ اصفہان گئے۔ یہاں جناب خواجہ بختیار کاکی کو آپ سے ملنے کا موقع ملا۔ جناب کاکی آپ کے مرید ہو گئے۔ اصفہان سے چلے تو خرقان پہنچے پھر استرآباد آئے اور یہاں کے مشہور بزرگ جناب شیخ ناصر الدین استرآبادی کے فیوضات باطنی سے استفادہ کیا۔
غرض یہ کہ سیاحت و بادیہ پیمائی میں استرآباد کے بعد ہرات، سبزوار، حصار، بلخ اور غزنین پہنچے۔ غزنین علم و فضل کا مرکز تھا۔ مگر ان دنوں سلطان محمود غزنوی کی اولاد کی حالت بہت پتلی تھی۔ اور غوری خاندان کا ستارہ اقبال چمک رہا تھا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا کہ آپ ۵۶۳ھ میں وارد بغداد ہوئے اور ۵۵۸ھ یا ۵۶۰ھ میں غزنیں پہنچے۔ بات کا پتہ نہیں چلتا۔ ۵۶۳ھ میں تو بغداد گئے، پھر وہاں سے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے غزنیں کیسے پہنچ گئے۔

بہر کیف جناب خواجہ غزنیں ضرور پہنچے۔ علاء اور حسین غوری نے ان دنوں غزنوی خاندان کے بادشاہ ناصر الدین شاہ کے عہد میں غزنیں کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ لیکن دو ہی برس گذرنے

پائے تھے کہ ناصر الدین شاہ کے انتقال کے بعد حسین غوری کا بھی انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد حسین غوری کا بیٹا سیف الدین محمد غوری تخت پر بیٹھا۔ بیس برس کا سن بھرپور جوانی مگر شعور پختہ نہیں تھا۔ سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے وہ ایک لشکرِ جرار لے کر ترکان غز کے استیصال کے لیے اٹھا۔ لیکن ایک موقع پر غزوں کو اکیلا ہاتھ آگیا اور انہوں نے موقع پاکر مار ڈالا۔

دوسرے سال خود ترکان غز نے پہل کی۔ مگر ملک شاہ غوری ان کے مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور لاہور میں آکر پناہ لی۔ غزوں نے شہر کو تاخت وتاراج کیا۔ خوب لوٹ کھسوٹ مچائی قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا۔ اور اس کے بعد غزنیں میں اپنا ایک نائب چھوڑ کر چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد ملک شاہ غزنیں آیا۔ اس نے ترکان غز کے نائب کو وہاں سے نکالا اور غزنیں پر دوبارہ قبضہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام دل دوز واقعات جناب خواجہ معین الدین چشتی کی نگاہوں کے سامنے ہوئے۔ خواجہ نے دیکھا کہ مسلمان بے عمل ہو چکے ہیں۔ عیش پرستی و ہوس کوشی نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ اور یہی ان کی خانہ ویرانی کا سبب ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ اور لوگوں کے ذہن کو جہاد کی طرف پھیرا۔

غزنیں کے بعد آپ نے پاک وہند کا رخ کیا۔ ان دنوں یہاں کے رہنے والوں کی جو حالت تھی وہ دنیا بھر کے جاہلوں کے مقابلہ میں سب سے بدتر تھی۔ ہندو مذہب کا دور دورہ تھا۔ بت پرستی عام تھی۔ بندوں نے مالک سے رشتے توڑ کر غیروں سے جوڑ رکھے تھے۔ اور غیروں کی یہ حالت سامنے ہونے کے باوجود کہ اگر کوئی کتا بھی ٹانگ اٹھا کر ان پر پیشاب کر جائے تو وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ اس کے بعد ان کے سامنے سر جھکاتے اور انہیں استمداد کا ذریعہ جانتے تھے۔

جناب خواجہ معین الدین چشتی پاک وہند کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سب سے پہلے لاہور میں وارد ہوئے۔ اور مخدوم علی ہجویری کے مزار پر چلہ کیا۔ اس کے بعد آپ لاہور سے آگے بڑھے تو دہلی ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے۔ ان دنوں شہاب الدین غوری دہلی اور اجمیر کے راجاؤں

سے شکست کھا کے گیا تھا۔ اور اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے پھر سے پر تول رہا تھا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کی نگاہ میں مسلمانوں کی جو کچھ وقعت و حیثیت تھی سو وہ ظاہر ہے نہایت حقارت سے دیکھے جاتے تھے۔

اجمیر میں ان دنوں پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ آپ نے وعظ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا لیکن جیساکہ قاعدہ ہے کہ اللہ والوں کے مزاج میں تلخی نہیں ہوتی وہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بڑے تحمل اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا کہ پرتھوی راج کو آپ سے مطلق شکایت پیدا نہ ہوئی۔

ایک خلق خدا آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو رہی تھی۔ آپ کا علم و عمل لوگوں کی نگاہ میں اثر پیدا کر رہا تھا۔ لیکن سیاسی احوال یہ تھے کہ شاہان اسلام ہندوستان پر بار بار حملہ کر رہے تھے اور فطرتاً مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں بغض و عناد پیدا ہو رہا تھا۔ اور ان کی خواہش تھی کہ تمام مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا لیا جائے۔ چنانچہ مصلحت ملکی کو سامنے رکھتے ہوئے پرتھوی راج جناب خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلاف ہو گیا۔

ایک روز پرتھوی راج نے اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہا یہ شخص (خواجہ) جانے لوگوں پر کیا جادو کر رہا ہے کہ لوگ اس کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں اور مسلمان ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ اسے ہمارے ملک میں آنے کا کیا حق ہے؟ کہتے ہیں یہ الفاظ کسی نے جناب خواجہ کو جا سنائے۔ آپ جوش میں آگئے اور فرمایا۔ وہ ہمیں یہاں سے نکالے نہ نکالے مگر ہم نے اسے نکال دیا۔

فرشتہ نے لکھا ہے شہاب الدین غوری کے مقابلہ میں پہلی جنگ میں پرتھوی راج دو لاکھ سوار لے کر پہنچا تھا۔ دوسری مرتبہ جو لڑائی ہوئی اس میں اس کے پاس تین لاکھ سوار تھے ہندوستان کے تمام راجا اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ جو تعداد میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہوں گے۔ اور تین ہزار ہاتھی تھے۔ ترا واڑی کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ خوب گھمسان کا

درس [illegible] شہاب الدین [illegible] [illegible] میں [illegible] راج [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] کر دیا

رن پڑا۔ بڑے بڑے راجاؤں نے شکست کھائی اور مارے گئے۔ پرتھوی راج نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر دریائے گنگا سے آگے نہیں پہنچنے پایا تھا کہ ایک دلیر آدمی نے تعاقب کر کے گرفتار کر لیا اور شہاب الدین غوری کے حضور میں پیش کر دیا۔ جہاں اسے ملک فنا کو روانہ کر دیا گیا۔ اور اس طرح جناب خواجہ کی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

(اس واقعہ کے بعد لوگوں کے دلوں میں جناب خواجہ کی شخصی عظمت اور علمی فضیلت نے پہلے سے زیادہ گھر کر لیا۔ وہ لوگ جو آپ کے دستِ حق پرست پر اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مسلمان ہو گئے) جو لوگ اسلام کو الزام دیتے ہیں وہ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ شہاب الدین غوری نے فتح یاب ہونے کے بعد ہندوستان میں اقامت اختیار نہیں کی بلکہ وہ اجمیر آیا پرتھوی راج کے بیٹے کو اپنا مطیع و باج گذار بنا کر واپس چلا گیا۔ صرف قطب الدین ایبک جو بعد میں ہندوستان کا شہنشاہ بنا اس فتح کے بعد ہندوستان میں شہاب الدین غوری کا نائب تھا اگر غوری یہاں رہتا تو آج ہندوستان کی حالت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

ہندوستان میں اسلام پھیلا تو انہی خواجہ معین الدین چشتی جیسے بوریہ نشینوں کے طفیل پھیلا ہے۔ ہر چند شاہانِ اسلام خواہ کتنے ہی عمدہ مسلمان کیوں نہ ہوں۔ لیکن ان کے بارے میں یہ کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے سرکاری طور پر اسلام کی تبلیغ کی۔ یا عیسائیوں کی طرح مشینری اسکول اور کالج قائم کیے۔ یہ صرف اولیائے کرام ہی کی کوششوں کا حصہ ہے کہ آج پاک و ہند کے بام و در اسلام کے نام سے آشنا ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی کے بیان میں ایک بات خاص ذکر کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ جناب سید حسن مشہدی جنہیں خنگ سوار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے قطب الدین ایبک نائب ہند کی طرف سے اجمیر کے داروغہ مقرر کیے گئے۔ خنگ سوار نہایت نیک نفس، پاک باطن اور پابند صوم و صلوٰۃ بزرگ تھے۔ لیکن باوجود اثنا عشری شیعہ ہونے کے جناب خواجہ کے ممد و معاون تھے۔ حالانکہ جناب خواجہ شیعہ نہیں تھے۔ لیکن ان کے طرزِ عمل اور حسن

اخلاق نے انہیں اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ تخنگ سوار ہر قدم پر خواجہ کے ساتھ رہے جس سے اسلام کی اشاعت کرنے اور خلق خدا کی خدمت کرنے میں بڑی مدد ملی۔

خواجہ معین الدین چشتی نے ہندوستان میں سلسلہ چشت کو ایسا پھیلایا کہ آج پاک و ہند میں چشتی سلسلے کے بزرگ ہر جگہ موجود ہیں۔ اور ان کے لاکھوں مریدین ہیں۔

سیرت العارفین میں لکھا ہے کہ آپ نے ستانوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ۶ رجب المرجب ۶۳۲ھ ہے۔ آپ اجمیر ہی میں فوت ہوئے۔ اور یہیں آپ کا مزار پُرانوار مرجع خلائق ہے۔

آپ کی تصنیفات کے بارے میں لکھا ہے اگرچہ آپ نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی البتہ آپ کے ملفوظات کو جمع کر کے مختلف کتابیں مرتب کر لی گئیں۔ جن میں سے ایک "دلیل العارفین" ہے۔ جسے آپ کے خلیفہ و مرید جناب بختیار کاکی نے مرتب کیا ہے۔

ولادت ــــــ ماورالنہر میں پیدا ہوئے۔ نام۔ بختیار قطب الدین۔ لقب۔ کاکی خطاب تھا۔ شجرۂ نسب یوں ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ابن کمال الدین بن موسےٰ بن احمد اوشی بن کمال الدین بن محمد بن احمد بن رضی الدین بن حسام الدین بن رشید الدین بن جعفر بن نقی الوجود بن علی موسےٰ رضا بن موسےٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن علی زین العابدین بن امام حسین بن حضرت علی کرم وجہہ اللہ۔

کاک کہتے ہیں روٹی کو۔ اس سے متعلق حکایات تو بڑی دلچسپ اور عجیب وغریب ہیں خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی بیگم صاحبہ سے ایک روز ایک بنیے کی بیوی نے طنزاً کہہ دیا کہ اگر میں تمہیں قرض نہ دوں تمہارے بچے بھوکوں مر جائیں"۔ آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے قرض لینے سے روک دیا۔ اور فرمایا کہ روزانہ حجرے کے طاق سے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر جس قدر کاک کی ضرورت ہو لے لیا کریں اور بچوں کو کھلا دیا کریں چنانچہ اسی واقعے کی بنا پر آپ کاکی کے نام سے مشہور ہوئے۔

خواجہ بختیار کاکی کا سلسلہ نسب ۱۴ واسطوں سے جناب امام حسینؑ سے جا ملتا ہے آپ کے والد محترم جناب خواجہ کمال الدین احمد بھی ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ خواجہ بختیار کاکی ابھی ڈیڑھ سال ہی کے تھے کہ آپ کے والد ماجد انتقال کر گئے۔ اور گھر کا تمام بوجھ آپ کی والدہ محترمہ کے کندھوں پر آ پڑا۔

ابو حفص نام ایک باکمال بزرگ سے جناب خواجہ صاحب نے علوم دین حاصل کیے پھر اپنی خداداد لیاقت سے تھوڑے سے ہی دنوں میں تبحر علمی پیدا کر لیا۔ جب خواجہ معین الدین چشتی پھرتے پھراتے اصفہان آتے ہیں۔ تو آپ ان کے مرید ہو گئے۔ مرید کیا ہوئے پھر عمر بھر کے لئے انہی کے ہو رہے۔

جب خواجہ معین الدین چشتی واپس ہندوستان آئے تو آپ سے ان کی جدائی گوارا نہ ہو سکی۔ چنانچہ آپ بھی وطن کو خیر آباد کہہ کر ملتان ہوتے ہوئے جناب شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور شیخ جلال الدین تبریزی کی مہمانی میں رہ کر اپنے پیر و مرشد جناب خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

سلطان شمش الدین التمش کا عہد حکومت تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جناب خواجہ بختیار کاکی دہلی تشریف لائے ہیں۔ اسے بزرگوں سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ جنگل سے شہر چلے چلیں۔ اور اپنے قدوم میمنت لزوم سے دلی بخشیں۔ لیکن آپ نے اس سے عذر کر دیا اور کہا کہ شہر میں پانی کی قلت ہے۔ اس لئے میرے لیے یہی جگہ مناسب ہے۔

سلطان کا قاعدہ تھا کہ ہفتہ میں دو بار ضرور خدمت حاضر ہوتا۔ اور اس بات کا طالب رہتا کہ آپ کسی چیز کی فرمائش کریں تو میں لاکر حاضر کر دوں۔ لیکن آپ نے بادشاہ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض پاتے آپ کی برکتوں کا یہاں تک اثر ہوا کہ ایک مرتبہ جب خواجہ معین الدین چشتی آپ سے ملنے کے

لیے دہلی تشریف لائے اور واپسی میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہا تو ہر طرف سے خلق خدا جناب خواجہ کی خدمت میں آ آ کر عرض کرتی کہ بابا بختیار کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں انہیں دہلی ہی میں رہنے دیں۔ چنانچہ لوگوں کے اصرار پر آپ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

جب شیخ الاسلام مولانا جمال الدین بسطامی کے انتقال پر مرحوم کا عہدہ خالی ہو گیا تو سلطان التمش نے آپ سے درخواست کی کہ شیخ الاسلامی کا منصب قبول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا ہم درویشوں کو اس سے کیا تعلق؟

جناب خواجہ بختیار کاکی کا قاعدہ تھا کہ وہ اوراد و وظائف گوشہ تنہائی میں ادا کرتے تھے۔ اور اپنے مریدوں کو بھی یہی رائے دیتے تھے چنانچہ آپ نے اپنے خلیفہ و مرید جناب شیخ فریدالدین گنج شکر سے بھی یہی فرمایا کہ اوراد و وظائف علیحدگی میں نہ کرنے سے شہرت ہوتی ہے۔ اور شہرت ہم فقیروں کے لیے سخت آفت ہے۔

خواجہ بختیار کاکی نے ۶۳۴ھ میں انتقال کیا اور دہلی (مہرولی) ہی میں مدفون ہوئے۔ طبیعت کا عالم یہ تھا کہ باوجود تنگ دست ہونے کے کبھی کسی سائل کو مایوس نہیں جانے دیا۔ لنگر خانے میں جو چیز آتی اسے فوراً فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور جس روز کوئی چیز نہ ہوتی تھی خادم سے فرماتے اگر آج لنگر میں کچھ بھی نہیں تو پانی کا دور چلاؤ۔ تقسیم اور عطا و بخشش سے آج کا دن بھی خالی کیوں جائے۔

شان فقر یہ تھی کہ ایک مرتبہ شاہی حاجب اختیارالدین ایبک آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی گاؤں بطور نذر پیش کیے۔ آپ نے فرمایا جس کا دل اللہ کی یاد سے آباد ہو وہ گاؤں لے کر کیا کرے گا۔ چنانچہ آئندہ کے لیے تنبیہ کر کے واپس کر دیے۔

آپ کے نام سے دو کتابیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک دیوان، دوسری فوائد السلوک

جن میں آپ کے ملفوظات ہیں اور انہیں آپ کے خلیفہ و مرید جناب فریدالدین گنج شکر نے ترتیب دیا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش

فوائدالسلوک میں لکھا ہے کہ التمش نہایت صحیح الاعتقاد اور صالح و راسخ العقیدہ شخص تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا اور عبادت کرتا۔ تمام عمر اس کو کسی نے سوتے نہیں دیکھا۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتا تو جلدی بستر سے اٹھ بیٹھتا۔ عالم تحیر میں کھڑا رہتا۔ پھر اٹھ کر وضو کرتا۔ اور مصلے پر جا بیٹھتا۔

اپنے ملازموں میں سے رات کے وقت کسی کو نہ جگاتا۔ کہتا کہ آرام کے ساتھ سونے والوں کو اپنے آرام کے لیے کیوں زحمت دی جائے۔ وہ خود ہی تمام کام سرانجام دے لیتا۔

وہ رات کو گدڑی پہن لیتا۔ تاکہ اس کو کوئی پہچان نہ سکے۔ ہاتھ میں سونے کا ایک ٹنکہ اور توشہ دان ہوتا۔ وہ ہر مسلمان کے گھر پر جاتا۔ ان کے حالات معلوم کرتا اور ان کی مدد کرتا۔ واپسی میں ویرانوں اور خانقاہوں سے ہوتا ہوا بازاروں میں گشت کرتا اور وہاں کے رہنے والوں کو آسائش پہنچاتا۔ اور پھر ان سے طرح طرح کی معذرت کر کے چپ چاپ چلا جاتا اور ان سے کہہ جاتا کہ اس مدد کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔

دن کو التمش کے دربار میں عام اجازت تھی کہ جو مسلمان رات کو فاقہ کرتے ہیں وہ اس کے پاس آئیں اور امداد پائیں۔

پھر جب غریب و حاجت مند لوگ اس کے پاس آتے۔ ان کی ہر طرح سے دل جوئی کرتا۔ اور ایک ایک کو قسمیں دے دے کر کہتا کہ دیکھنا فاقہ نہ کرنا۔ تمہیں جب کسی شے کی ضرورت

پڑے ۔ مجھ سے آکر بیان کرو ۔ اور اگر کوئی شخص تم سے بے انصافی کرے اور تم پر ظلم و ستم ڈھائے ، یہاں آکر زنجیر عدل ہلاؤ ، تمہاری فریاد سنی جائے گی ۔ اور تمہارا انصاف کیا جائے گا ۔

پھر لوگوں سے رو کر کہتا ۔ کہ اگر تم مجھ سے آکر اپنی شکایت نہ کہو گے تو کل قیامت کے دن تمہاری فریاد کا بوجھ مجھ سے نہ اٹھایا جا سکے گا ۔

فریدالدین گنج شکر

فریدالدین مسعود گنج شکر، فاروقی چشتی

نام :۔ مسعود۔ لقب :۔ فریدالدین۔ عرفت :۔ گنج شکر

وجہ تسمیہ :۔ ماں انسان کے لیے درس گاہ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا میں جتنے مشاہیر و برگزیدہ انسان گذرے ہیں اگر ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی شخصیت کو بنانے اور ان کا مستقبل سنوارنے اور سورج کی طرح روشن کرنے میں سب سے پہلے ان کی ماؤں نے ہی جدوجہد کا آغاز کیا۔

جناب فریدالدین کی والدہ محترمہ بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ جن کی تربیت سے ان کے بچے شہرت کے آسمان کے چاند، ستارے اور سورج بن کے چمکے۔ جناب فریدالدین کی والدہ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ مصلے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتیں۔ اور فرماتیں جو بچے نماز پڑھتے ہیں ان کو مصلے کے نیچے سے شکر کی پڑیا ملتی ہے۔ اس ترکیب کا اثر یہ ہوا کہ جناب فریدالدین بچپن ہی سے نماز کے سخت پابند ہوگئے۔ اور کبھی نماز قضا نہ کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے آگے چل کر آپ نے گنج شکر کے نام سے شہرت پائی۔

ولادت :۔ ۵۶۹ھ موضع کوتوال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ اور سن بلوغ کو پہنچنے تک یہیں رہے آپ کے والد محترم جناب مولانا کمال الدین سلیمان ساتویں واسطے سے فرخ شاہ بادشاہ کابل کے فرزند اور بیسویں واسطے سے جناب عمر فاروق کی اولاد سے تھے۔ جناب

کمال الدین کی والدہ محترمہ سلطان محمود غزنوی کے خاندان سے تھیں۔

فریدالدین گنج شکر کی والدہ محترمہ جناب مولانا وحیدالدین خجندی کی صاحب زادی تھیں مولانا کمال الدین شہاب الدین غوری کے زمانے میں کابل سے لاہور آئے ۔ اور پھر کچھ دنوں بعد قصور وملتان میں تھوڑا سا قیام کر کے موضع کوتوال آرہے ۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔

جناب فریدؒ نے ابتدائی تعلیم کوتوال ہی میں حاصل کی ۔ اس کے بعد ملتان آ گئے یہاں آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا ۔ اور عربی کے مروجہ درسی نصاب مکمل کیا ۔ انہی دنوں میں جناب خواجہ بختیار کاکی ملتان تشریف لائے ۔ آپ کو ان سے ملاقات کرنے کا موقعہ ملا ۔

آپ جناب خواجہ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہو گئے ۔ خواجہ صاحب نے فرمایا ۔ میاں فرید جب تک علم حاصل نہیں کرو گے ، بات نہیں بنے گی ۔ جاؤ پہلے علم حاصل کرو ۔ پھر میرے پاس آنا ۔ جناب فرید اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں اب حصولِ علم کے لیے بادیہ پیمائی پر مستعد ہوئے چنانچہ آپ ملتان سے قندھار کو چل دیے ۔ پھر وہاں سے بغداد ، سیستان و بدخشاں کی خاک چھانتے ہوئے پانچ برس کی عمر میں تمام علوم ظاہری کی تکمیل کی ۔ اس دوران میں آپ کو جناب شیخ شہاب الدین بانی سلسلہ سہروردیہ سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ۔ شیخ سیف الدین خضری ، شیخ سعیدالدین حموی ، شیخ اوحدالدین ، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور شیخ فریدالدین عطار وغیرہ ہم بزرگانِ دین سے بھی ملاقاتیں نصیب ہوئیں ۔ اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ۔

غرض تکمیل علوم دین کے بعد آپ جناب خواجہ بختیار کاکی کے حضور میں دہلی پہنچے ۔ خواجہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔ اور آپ کے لیے غزنیں دروازے کے باہر ایک جگہ منتخب کی جہاں آپ ریاضت و مجاہدے میں ہر وقت مشغول رہتے ۔

سیر الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے متواتر روزے رکھے ۔ ایک دن افطاری میں آپ کو کوئی شے میسر نہ آئی ۔ ناچار بھوک و پیاس کی حالت میں آپ نے منہ میں چند سنگریزے اٹھا کر رکھ لیے ۔ قدرت خدا کہ وہ شکر کے چند دانے نکلے ۔ جناب خواجہ کو اس واقعہ کی اطلاع

ملی تو فرمایا فریدالدین واقعی گنج شکر ہے۔

خلق خدا آپ کے زہد و عبادت سے بے حد متاثر تھی۔ اکثر آپ کے پاس لوگوں کا اژدھام رہتا تھا۔ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مرادیں لے کر واپس جاتے۔

جناب فریدالدین کو شہرت و نام و نمود سے سخت نفرت تھی۔ جب لوگوں کا ہجوم دن پر دن زیادہ ہونے لگا تو آپ دہلی چھوڑ کر حھانسی چلے گئے۔ حتیٰ کہ جناب خواجہ کا انتقال ہوا تو آپ دہلی تشریف لائے۔ پھر چند روز قیام کر کے یہاں سے پاکپٹن روانہ ہو گئے۔

اجودھن جسے ان دنوں پاکپٹن کہتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں ایسے لوگوں کا مرکز تھا کہ جنہیں فقیروں اور درویشوں کے ساتھ خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب آپ یہاں پہنچے اور لوگوں کے طور طریقے کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ ان لوگوں کے نزدیک درویشوں، صوفیوں اور فقیروں کی کوئی وقعت نہیں۔ بہت خوش ہوئے، فرمایا کہ ہم فقیروں کے رہنے کے لیے یہی جگہ سب سے موزوں ہے۔

چنانچہ آپ نے آبادی سے تھوڑی دور جنگل میں ایک درخت کے نیچے اپنا کمبل بچھا لیا۔ اور اللہ کی یاد میں محو ہو کر بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ آپ کے باطن کی برکتیں لوگوں پر ظاہر ہونے لگیں لوگ جوق در جوق آپ کے پاس آنے لگے۔

جب آپ کے مریدین و معتقدین میں کافی حد تک اضافہ ہو گیا تو آپ نے اپنے بیوی بچوں کے لیے شہر کی جامع مسجد کے قریب ہی ایک مکان بنا لیا۔ جہاں آپ کے اہل و عیال نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مگر آپ خود اسی درخت کے نیچے رہتے اور وہیں رات بسر کرتے تھے۔

کہتے ہیں آپ کے پاس فقط ایک ہی کمبل تھا جسے دن میں بچھا کر بیٹھ جاتے۔ رات کو وہی اوپر اوڑھ کر سو جاتے۔ کمبل اتنا چھوٹا تھا کہ آپ کے پیر پورے طور پر پھیل نہ سکتے تھے۔ ایک لکڑی کا تکیہ تھا جس کا سرہانہ بناتے۔ اور ایک عصا تھا جو حضرت خواجہ بختیار

کاکی کے تبرکات سے آپ کو پہنچا تھا۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کا بادشاہ ناصرالدین محمود آپ کی زیارت کے لیے دہلی سے پاکپتن آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اللہ والوں کی ملاقات میں یقیناً ایک روحانی کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور انسان ان کے قرب سے طمانیت قلب محسوس کرتا ہے۔ سلطان ناصرالدین محمود آپ سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ چنانچہ واپس دہلی پہنچ کر اپنے وزیر الغ خان کے ہاتھ پانچ گاؤں اور ایک بہت بڑی رقم آپ کی خدمت میں نذرانے کے طور پر ارسال کی۔

آپ نے الغ خاں سے (جو بعد میں سلطان بلبن کے نام سے مشہور ہوا) فرمایا ہم فقیروں کو ان چیزوں سے کیا واسطہ؟ یہ انہیں کو لے جاکر دے دو جو اس کے ضرورت مند ہیں۔

سلطان غیاث الدین بلبن شہنشاہ ہند کی دختر نیک اختر آپ کے عقد میں تھیں اور ان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے ہوئے۔ رشتہ کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ آپ کا سلطان سے کتنا مضبوط تعلق تھا۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت مند نے سلطان کے دربار میں آپ سے ایک سفارش کرائی۔

آپ نے سلطان کے نام ان الفاظ میں سفارشی رقعہ لکھا:۔

میں نے اس شخص کا معاملہ، پہلے اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیا ہے۔ اب اگر آپ اس کا کام کر دیں۔ کام تو اللہ تعالےٰ ہی کرے گا مگر شکریہ آپ کے حصہ میں آئے گا۔ اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو خدا کو بھی منظور نہیں۔ اس لیے آپ کا کیا قصور ہے۔

جناب نظام الدین محبوب الٰہی لکھتے ہیں کہ حضرت فرید الدین گنج شکر کا عہد ولایت خیر الاعصار ہے۔ کیونکہ آپ کے زمانے میں کافی مشائخ عظام جمع ہو گئے تھے۔

محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ جناب شیخ زکریا بہاؤالدین ملتانی، شیخ سیف الدین نہری اور جناب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر ایک ہی زمانہ میں ہوئے۔ تینوں یکے بعد دیگرے تین

تین سال بعد فوت ہوئے ہیں۔

جناب فریدالدین مسعود گنج شکر نے ۶۶۴ ہجری میں انتقال فرمایا۔ پاک پٹن ہی میں مدفون ہوئے۔ جہاں ہر سال محرم کے مہینے میں آپ کا عرس ہوتا ہے۔

آپ کی تصنیفات وہ ملفوظات ہیں جن کو آپ کے داماد و مرید جناب نظام الدین محبوب الہی نے مرتب کیا ہے۔ ایک کا نام ہے راحت القلوب، دوسری کتاب کا نام ہے۔ سیرالاولیا۔ سیرالاولیا کو ایک خلیفہ و مرید جناب بدر اسحاق نے مرتب کیا ہے۔

کہتے ہیں آپ ہمیشہ روزہ رکھتے، سخت ریاضت و محنت کرتے۔ فراغت پاکر غسل کرتے اور نماز پڑھتے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر نماز غسل کر کے ادا کرتے تھے۔ مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ سخت محنت و مشقت کے باوجود آپ کی صحت ہمیشہ عمدہ رہی۔

ایک مرتبہ ایک درویش ملاں یوسف نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب مولانا نظام الدین دہلوی تو چند روز آپ کی خدمت میں رہے اور فیوض باطنی سے مالا مال ہو کر چلے گئے ایک میں ہوں کہ برسوں سے آپ کی خدمت میں پڑا ہوں۔ مگر آپ کے فیوض باطنی سے محروم ہوں۔

یہ شکایت سن کر آپ نے ایک چھوٹے سے بچے کو بلایا اور اس سے کہا بیٹا وہ سامنے جو اینٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ہمارے لیے ایک اینٹ لے آؤ۔ وہ بچہ گیا اور آپ کے لیے ایک عمدہ سی اینٹ لے آیا۔ پھر آپ نے اس سے کہا اچھا اب ایک اینٹ مولانا نظام الدین کے لیے بھی لے آؤ۔ وہ بچہ پھر گیا اور ایک عمدہ سی اینٹ اور لے آیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر فرمایا۔ اچھا اب ایک اینٹ ملا یوسف کے لئے بھی لے آؤ۔ بچہ پھر گیا اور ایک اینٹ اٹھا لایا۔ مگر اب کے جو اینٹ لایا وہ اینٹ کا ایک بے ڈھنگا سا ٹکڑہ تھا۔ آپ نے ملاں یوسف سے کہا اس میں میری کچھ کوتاہی نہیں۔ یہ تمہاری ناقابلیت کا نتیجہ ہے اور قسمت کی بات ہے ورنہ میرے لیے تو سب برابر ہیں۔

آپ بات بات میں ایسے لاجواب نکتے بیان فرماتے تھے کہ اگر یورپ زدہ لوگ ان کو دیکھ لیں تو یورپ کے فلاسفروں کو بھول جائیں ۔ آپ کے اقوال میں ان لوگوں کو جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں زندگی مل جاتی ہے ۔

اقوال :۔

(۱) نامرادی کا دن مردوں کی شب معراج ہے۔
(۲) سبک ساری کی خواہش کمزوری کی علامت ہے ۔
(۳) جیسا تو ہے ویسا ہی لوگوں کو دکھا ورنہ اصلیت خود بخود کھل جائے گی۔
(۴) احمق کو زندہ خیال نہ کرو۔
(۵) وہ شے جو خریدی نہ جاتی ہو اسے فروخت نہ کرو۔
(۶) ہر کسی کی روٹی نہ کھاؤ مگر ہر شخص کو اپنی روٹی کھلاؤ۔
(۷) گناہ پر فخر نہ کرو ۔ آرائش کے پیچھے نہ پڑو۔
(۸) جس چیز کی کوشش کرو اس سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔
(۹) جو تم سے ڈرے ۔ اس سے ہر وقت اندیشہ کرو۔
(۱۰) دروغ نما راستی کو ترک کر دو۔
(۱۱) قاتل نما بے وقوف سے پرہیز کرو۔
(۱۲) وقت کا کوئی بدلہ نہیں ۔
(۱۳) ہنر ذلت سے سیکھ یعنی تحصیل علم و ہنر میں کسی ذلت کا خیال نہ کرو۔
(۱۴) دشمن کی دشمنی اس سے مشورہ کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے ۔
(۱۵) کوئی مصیبت خدا کی طرف سے آئے اس سے ہراساں نہ ہو۔
(۱۶) اگر ہے کچھ" غم نہیں اگر نہیں ہے تو بھی غم نہیں۔

۱۷- درویشوں کے لیے فاقہ سے مرنا لذت نفس کے لیے قرض لینے سے بہتر ہے۔

۱۸- دو آدمیوں کا مباحثہ ایک آدمی کے اکیلے سوچنے کی دو سالہ محنت سے زیادہ مفید ہے۔

آپ کی جسمانی و روحانی اولاد تو بے شمار ہے مگر یہاں ہم صرف اتنا بتانے پر اکتفا کریں گے کہ آپ کے خلیفہ اول جناب قطب جمال الدین ہانسوی ہیں۔ دوم جناب مولانا نظام الدین محبوب الٰہی جن سے سلسلۂ نظامیہ چشتیہ چلا۔ سوم جناب مخدوم علاء الدین کلیر صابری ہیں۔ جن سے چشتیہ صابریہ کا سلسلہ منسوب ہے۔

جناب مخدوم صابر کلیری کے مختصراً سوانح حیات یہ ہیں۔

ولادت:۔ ۵۹۲ ہجری۔ کوتوال ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم جناب سید عبدالقادر جیلانی کے پوتے اور آپ کی والدہ محترمہ جناب فریدالدین مسعود گنج شکر کی حقیقی بہن تھیں:

آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد آٹھ سال کی عمر میں آپ اپنے ماموں جان کی خدمت میں پاکپتن آ گئے۔ ۶۰۳ ہجری میں ان سے بیعت کی۔

جناب مخدوم کلیری اپنے ماموں کے لنگر کے انچارج تھے۔ فقیروں، درویشوں اور دوسرے حاجت مندوں میں آپ ہی کھانا تقسیم کیا کرتے تھے۔ سب کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے مگر خود بھوکے رہتے تھے۔ اسی رعایت سے آپ کو جناب فریدالدین نے صابر فرمایا جو آگے چل کر آپ کی شہرت کا سبب ہوا۔

جب علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر چکے۔ تو آپ کو دین اسلام کی تبلیغ اور علوم دین کی اشاعت کے لیے جناب فریدؒ نے شہر فیض بخش کلیر کو جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ پاکپتن سے کلیر تشریف لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے فرض منصبی کو ادا کرنا شروع کر دیا۔

ابھی کلیر میں آئے ہوئے آپ کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ آپ کے کمالات علمی کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ ایک خلق خدا آپ سے فیض پانے لگی۔

ایک مرتبہ آپ جمعتہ المبارک کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے درویشوں کے ساتھ شہر کی جامع مسجد میں گئے۔ اور اس پہلی صف میں جاکر بیٹھ گئے جو شہر کے معززین کے لیے مخصوص تھی۔ جب شہر کے امراء و مشائخ آئے اور انہوں نے اپنی جگہ نہ پائی تو انہوں نے آپ اور آپ کے درویشوں سے تعرض کیا۔ اور سختی سے کہا کہ یہ ہمارے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں امیر و غریب، شاہ و گدا سب برابر ہیں۔ ان کا تعرض کرنا اسلامی کی تعلیمات کے خلاف تھا۔ اللہ تعالےٰ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

کہتے ہیں شہر کی جامع مسجد گر گئی اور ہزاروں آدمی اس کے نیچے دب کے مر گئے اور شہر تمام کا تمام برباد ہو گیا۔ طاعون کی ایسی بیماری پڑی کہ بارہ بارہ کوس تک کوئی چرند پرند حیوان اور انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

آپ کی طبیعت میں جلال بہت زیادہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کے رعب و داب سے متعلق لوگوں نے طرح طرح کے قصے پھیلا رکھے ہیں۔ ہمیں ان قصوں سے مطلق غرض نہیں۔ ہمارے نزدیک ستائش کا پہلو تو یہ ہے کہ آپ خلاف شریعت نہ خود چلتے اور نہ دوسروں کو چلتا دیکھ سکتے تھے۔ بلکہ احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سختی سے ڈانٹتے تھے۔ جب شہر کلیر برباد ہوا ہے تو اس کے بعد لوگوں پر آپ کی روحانی قوت کی اتنی ہیبت چھا گئی کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوئے انہیں خوف آتا تھا۔

آپ کے خلفاء میں جناب شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ کے ممتاز خلیفہ ہیں۔ وہ آپ کی خدمت میں کامل تیس برس تک رہے۔ اور کبھی آپ سے جدا نہیں ہوئے۔ جب ترک پانی پتی آپ سے روحانی تحصیل کر چکے تو آپ نے انہیں حکم دیا کہ جاؤ سواروں میں جاکر ملازم ہو جاؤ۔ اور دیکھو جس روز تمہاری کوئی دعا کسی کے حق میں قبول ہو جائے سمجھ لینا کہ میں دنیا سے چلا گیا۔ چنانچہ ترک پانی پتی مرشد کے حکم سے شاہی فوج میں نوکر ہو گئے۔ اور سلطان

علاء الدین خلجی کے ساتھ چتور گڑھ کی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔

سلطان نے بڑی کوشش کی، اور ایک طویل عرصے تک قلعہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ مگر قلعہ فتح نہ ہوا۔ اسی دوران میں ایک روز رات کو ایسی آندھی چلی کہ تمام لشکر کے چراغ بجھ ہو گئے مگر ایک چراغ جل رہا تھا جسے دیکھ کر سلطان کو بڑا تعجب ہوا۔ سلطان معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص خیمے میں بیٹھا قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا ہے۔ اور اس شدید آندھی کے آنے کے باوجود چراغ جل رہا ہے۔ وہ یہ ماجرا دیکھ کر چپ چاپ مؤدب کھڑا رہا۔ جب ترک پانی پتی قرآن حکیم کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو سلطان کو باہر کھڑا دیکھ کر جلدی سے اس کی تعظیم کے لیے آگے بڑھے اور پوچھا کہ حضور نے اس وقت کیسے زحمت فرمائی۔ سلطان نے کہا میرا قصور معاف کر دیجیے اور اللہ کی بارگاہ میں دعا کیجیے کہ قلعہ فتح ہو جائے آپ نے یہ سن کر کہا کہ میں تو آپ کی فوج کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہوں۔ مجھے ایسی مقبولیت کہاں نصیب ہے جو میری دعا قبول ہو جائے۔ آپ کو شاید کسی نے بہکا دیا ہوگا۔ سلطان نے اصرار کیا کہا نہیں ایسا نہ کہیے۔ آپ دعا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائے گا۔ چنانچہ ترک پانی پتی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اللہ نے دعا قبول کر لی۔ قلعہ فتح ہو گیا۔

قدرت خدا جناب مخدوم کلیری کی بات پوری ہوئی۔ جس روز ترک پانی پتی کی دعا قبول ہوئی۔ اسی روز جناب مخدوم کلیری کا انتقال ہو گیا۔ ترک پانی پتی کے دل نے اس واقعہ ناگزیر کی گواہی دی۔ چنانچہ وہ کلیر پہنچے اور اپنے مرشد کے تجہیز و تکفین کے فرض کو سرانجام دیا۔

جناب مخدوم علاء الدین کلیری صابری نے ۶۹۰ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار کلیر ضلع سہارن پور میں نہر گنگ کے کنارے پر واقع ہے۔

شہنشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنے عہد حکومت میں آپ کے مزار کا گنبد تعمیر کرایا تھا۔ آپ کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے۔ تمام مذاہب کے لوگ بلا امتیاز و تخصیص کے اس میں شامل ہوتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے آپ کے عرس کی ایک کیفیت لکھی ہے۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ سے چودہ تک جناب مخدوم کلیری کا عرس ہوتا ہے۔ جس میں دو لاکھ کے قریب مجمع ہوتا ہے۔ صابریہ سلسلے کے تمام مشائخ اور ان کی خانقاہوں کے سجادہ نشین اس میں شامل ہوتے ہیں۔ نذر و نیاز اور لنگر کے طعام کے لیے کم سے کم پانچ لاکھ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہ رقم وہ ہے جو سال بھر تک ہر درویش اپنے مریدین سے لنگر کے خرچ کے لیے نذر و نیاز قبول کر کے جمع کرتا ہے۔ اور عرس کے موقع پر یہاں لا کر خرچ کر دیتا ہے۔

سینکڑوں بنیے گھی، قند، اور چاول وغیرہ مسلمان زائرین کے ہاتھ فروخت کر کے چند ہی دنوں میں مالا مال ہو جاتے ہیں۔ تقسیم طعام کی یہ صورت ہوتی ہے کہ ہر فقیر کے پاس بریانی کے چاولوں اور خمیری روٹیوں کا ایک انبار لگ جاتا ہے۔ جہاں تک وہ کھا سکتے ہیں کھاتے ہیں جو خشک ہو سکتا ہے اس کو سکھا کر بطور تبرک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

صابریہ سلسلہ کے بعض بعض مشائخ ایسے بھی آتے ہیں جو ہزار ہزار روپیہ کا کھانا پکوا کر فقیروں اور غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ حلوے اور مٹھائیوں پر نیاز دلواتے ہیں۔

غرض عرس کی دھوم دھام کہاں تک بیان کریں۔ یہ موقع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سماع کی محفلیں، فاتحہ خوانی اور ذکر و شغل کے حلقے۔ حال و قال اور وعظ و نصیحت کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔

بہاؤالدین زکریا ملتانی

ولادت: ۵۷۸ ہجری ۔ ملتان میں پیدا ہوئے۔
آپ کے باپ دادا چنگیز خاں کے زمانے میں خوارزم سے نکل کر ملتان آئے۔
اور یہیں آباد ہو گئے۔

آپ کے جدّ اعلیٰ کمال الدین علی شاہ مکہ معظمہ سے نکل کر خوارزم میں آباد ہو گئے۔ جہاں شیخ وجیہہ الدین پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ میہار بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیز ابن قصئے قریشی سے جا ملتا ہے۔

شیخ وجیہہ الدین کی شادی مولانا حسام الدین ترمذی ایک ممتاز بزرگ کی بیٹی سے ہوئی۔
جن کے بطن سے جناب غوث بہاؤالدین زکریا ملتانی تولد ہوئے۔

آپ کو پانچ برس کی عمر ہی سے تعلیم دین کی طرف راغب کیا گیا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر کو پہنچنے تک آپ کو اتنی تحصیل علم ہو گئی تھی کہ جتنی کوئی صاحب شعور سات برس کی مدت میں حاصل کر سکتا ہے۔

آپ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ انتقال فرما گئیں عین عالم جوانی میں آپ کے والد محترم انتقال فرما گئے۔

والد محترم کے بعد چونکہ ان کے سر پر کسی مشفق بزرگ کا سایہ نہ رہا۔ اس لیے وہ حصول تعلیم کے لیے ملتان سے خراسان چلے گئے۔ اور یہاں کے علماء فضلا سے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر بخارا چلے گئے۔ وہاں نہ صرف تحصیل علوم ظاہری کی بلکہ اجتہاد کا درجہ پا لیا۔

پھر بخارا سے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ یہاں پانچ برس تک مجاوری کرتے رہے۔ یہاں سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ شیخ کمال الدین محمد یمنی سے علم حدیث حاصل کیا۔

پھر بیت المقدس پہنچے۔ شیوخ سے ملے۔ یہاں سے چل کر پھر بغداد آرہے۔ اور جناب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی سے فیض صحبت اٹھایا۔ ان سے علوم باطنی حاصل کیے۔ اور خرقہ خلافت پایا۔

کہتے ہیں جناب شیخ شہاب الدین سہروردی کے درویشوں نے یہ دیکھ کر کہ زکریا ملتانی کو صرف سترہ دن جناب شیخ کی خدمت میں رہنے سے خرقہ خلافت مل گیا۔ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے کہ ہم اتنی مدت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں ہمیں تو خرقہ خلافت عطا نہیں ہوا۔ مگر یہ سندی درویش چند ہی دنوں کی حاضری سے خرقہ خلافت لے کر چلتا بنا۔ کہتے ہیں کہ بات کہیں ہوتے ہوتے جناب شیخ تک پہنچ گئی۔ آپ نے فرمایا۔ اے درویشو! تم لوگ تر اور سبز لکڑی کی طرح ہو۔ اور زکریا ملتانی خشک لکڑی کی مانند ہے۔ جس تیزی و سرعت کے ساتھ سوکھی لکڑی آگ پکڑتی ہے تر لکڑی نہیں پکڑ سکتی۔ درویشوں نے یہ بات سن کر ندامت محسوس کی اور خاموش ہو رہے

جناب زکریا خرقہ خلافت پانے کے بعد اپنے مرشد کے حکم سے ملتان واپس آگئے! اور یہاں پہنچ کر آپ نے سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ آپ کے ایک پیر بھائی جناب شمس الدین تبریزی جو آپ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ تبلیغ اسلام میں آپ کے ممد و معاون بن گئے

جناب زکریا نے ملتان میں دین اسلام کی تعلیم کے لیے سب سے پہلے ایک مدرسہ قائم کیا۔ جس کے اثر سے ملتان میں اسلامی زندگی ظہور میں آئی۔ اور لوگوں کے دلوں میں خدا کی یاد رہنے لگی۔ اس کے بعد آپ کی طبیعت کی فیاضی اور دل کی سخاوت نے خلق خدا کو ولایت کا مفہوم سمجھانا شروع کیا چنانچہ کہتے ہیں ایک مرتبہ آپ کے ایک مرید جناب خواجہ کمال الدین مسعود شیروانی جو ہیرے جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ دیگر سوداگروں کے ساتھ بحری جہاز میں سوار تھے۔ جب جہاز عدن کے لیے روانہ ہوا تو ابھی تھوڑی ہی دور پہنچا ہو گا کہ باد مخالف چلنے لگی۔ اور جہاز کے مسافر گھبرا گئے۔

یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو بچنے کی امید نہ رہی۔ ایسے عالم حسرت و یاس میں خواجہ کمال الدین نے خدا کی بارگاہ میں فریاد کی اور تمام تاجروں نے اپنے دل میں کہا کہ اے پروردگار! اگر ہم اس عذاب اور طوفان سے تیرے فضل و کرم سے صحیح و سالم پار اتر گئے تو ہم تیری راہ میں اپنے مال و اسباب کا تیسرا حصہ خیرات کریں گے۔

کہتے ہیں خواجہ کمال الدین و دیگر تاجروں کی نگاہوں کو یوں محسوس ہوا کہ اللہ تعالٰی نے جناب زکریا ملتانی کو جہاز والوں کی مدد کے لیے بھیج دیا اور قدرت خدا جہاز بخیر و عافیت عدن پہنچ گیا۔

تمام سوداگروں نے اپنے مال و اسباب کا تیسرا حصہ خواجہ کمال الدین کے حوالے کیا۔ خواجہ نے فخر الدین گیلانی کے ہاتھ جناب زکریا ملتانی کے پاس بھیج دیا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ یہ رقم ستر لاکھ روپے تھی۔

جناب زکریا ملتانی نے اس رقم کو قبول کر کے اسی وقت شہر کے تمام غریبوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیا۔ اور خود اس سے دامن جھاڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ کہتے ہیں اس واقعہ سے تمام ملتان میں آپ کی سخاوت و فراخدلی کی دھوم مچ گئی۔ اور آپ نے لوگوں پر عملاً ثابت کر دکھایا کہ جن خوش نصیبوں کو خدا مل جاتا ہے انہیں پھر کسی شے کی حاجت نہیں۔ جو خدا کے قرب کو پا لیتے ہیں وہ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

لکھا ہے خواجہ گیلانی بھی آپ کے اس جود و سخا سے اتنے متاثر ہوئے کہ دنیا کی دولت کو لات مار کر فقیر ہو گئے۔ اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اور پچیس برس تک آپ کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے۔ مگر ابھی راستے میں ہی تھے کہ جاں بحق ہو کر انتقال کر گئے۔ یہیں ان کا مزار ہے۔

جناب زکریا ملتانی کا یہ معمول تھا کہ خود تو روزے رکھتے اور سادہ غذا کھاتے۔ مگر ایک خلق خدا کو بلا بلا کر باورچی خانے میں لاتے اور طرح طرح کے لذیذ کھانے کھلاتے۔ اور

اور انہیں کھانا کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے

ایک مرتبہ ملتان میں سخت قحط پڑا۔ ملتان کے حاکم کو غلہ کی ضرورت پڑی۔ آپ نے کئی من غلہ اس کے پاس پہنچا دیا۔ جب وہ غلے کو بحفاظت کسی جگہ رکھوا رہا تھا تو اس میں سے نقرئی سکے کے سات کوزے بھی نکلے۔ ملتان کے حاکم نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ آپ نے فرمایا ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ بھی ہم نے تمہیں کو بھیجے ہیں۔

ایک روز آپ نے خادم سے فرمایا۔ جاؤ فلاں صندوقچہ اٹھا لاؤ۔ اس میں پانچ ہزار اشرفیاں پڑی ہیں۔ خادم گیا۔ ادھر ادھر دیکھا بھالا مگر اتفاق سے نہ ملا۔ خدمت میں واپس آیا اور عرض کیا معلوم نہیں صندوقچہ کہاں رکھا ہے مجھے تو نہیں ملا۔ آپ نے فرمایا الحمد اللہ اور خاموش ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد خادم پھر آیا اور آکر صندوقچہ کے مل جانے کی اطلاع دی۔ آپ نے پھر فرمایا الحمد اللہ۔ ایک شخص جو آپ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ کہنے لگا، یا حضرت! آپ کے دونوں مرتبہ الحمد اللہ کہنے کے کیا معنی ہیں؟ میں سمجھ نہیں سکا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ ہم فقیروں کے نزدیک کسی شے کا وجود و عدم دونوں یکساں ہیں۔ اس لیے ہمیں نہ کسی کے آنے کی خوشی اور نہ کسی کے جانے کا غم۔ اس کے بعد آپ نے وہ پانچ ہزار اشرفیاں اسی وقت محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں۔

آپ کسی سے اپنی تعظیم و تکریم کی خواہش نہیں رکھتے تھے ایک مرتبہ آپ کے چند ایک درویش وضو کر رہے تھے کہ آپ بھی ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر تمام درویش آپ کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ایک درویش نے جو وضو کر رہا تھا۔ اس وقت آپ کی تعظیم و تکریم کی کہ جب وہ وضو سے فراغت پا چکا۔ آپ نے فرمایا۔ تم درویشوں میں سے سب سے افضل و زاہد ہو۔

لیکن آپ دوسروں سے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔ ایک موقع پر جلال الدین تبریزی نیشاپور علیہ آپ سے علیحدہ ہو کر خراسان چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ سلطان

التمش کی دعوت پر دہلی تشریف لائے۔ سلطان مع علماء و مشائخ کے شہر سے باہر آپ کے استقبال کو بڑھا اور ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ پھر انہیں سب کا امام بنا کر ان کے پیچھے پیچھے شہر کو روانہ ہوا کہتے ہیں شیخ الاسلام نجم الدین حضری کو سلطان کی یہ ادا پسند نہ آئی اور وہ تبریزی سے حسد کرنے لگا۔ بعد میں بغض و حسد کی آگ یہاں تک بھڑک اٹھی کہ انہیں سلطان کی نگاہوں سے گرانے کے لیے اس نے ان پر زنا کا الزام لگا دیا اور اس جرم کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے ایک فاحشہ عورت گواہی دینے کے لیے معاوضہ لے کر تیار ہوگئی۔

جب سلطان کے سامنے اس واقعے کو پیش کیا گیا تو سلطان سکتے میں آگیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی ایسا جرم نہ آسکتا تھا۔ کہ جس کا کوئی ولی اللہ مرتکب ہو۔ ہر چند وہ سمجھتا تھا کہ یہ الزام غلط ہے اور گواہی دینے والی عورت جھوٹی ہے۔ اور فاحشہ کار ہے۔ تاہم قانون کا تقاضا جب تک پورا نہ ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہندوستان کے تمام علماء و مشائخ کو دربار میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ زکریا بہاؤالدین سے بھی التماس کیا گیا۔ چنانچہ آپ بھی دہلی تشریف لے گئے۔

دہلی کی جامع مسجد میں اس مقدمہ کے فیصلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چنانچہ جمعہ کا دن تھا۔ تمام علماء و مشائخ نے شرکت کی۔ شیخ الاسلام نجم الدین حضری کو آپ کی اور جناب تبریزی کی آپس میں کشیدگی کا علم تھا۔ اس نے اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے جناب زکریا بہاوالدین کو حکم مقرر کر دیا۔

جمعہ کی نماز کے بعد سوچی سمجھی بات کے مطابق فاحشہ عورت پیش ہوئی۔ اور جناب تبریزی کو بھی طلب کیا گیا۔ جس وقت جناب تبریزی مسجد کے دروازے تک پہنچے تو تمام علمائے ربانی و مشائخ سبحانی آپ کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب حضرت اپنی جوتیاں اتار کر آگے بڑھے تو جناب زکریا نے آپ کی جوتیاں اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ سلطان نے یہ دیکھ کر کہ جس بزرگ کا جناب زکریا ایسے عالی مرتبت ولی اتنا ادب و احترام کریں۔ وہ کیونکر مجرم

ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ بظاہر تو جناب تبریزی کو مجرم کہا جارہا ہے ۔ اس لیے آپ کو اس احترام سے روک دینا چاہا۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ میں شیخ جلال الدین تبریزی کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں ۔ لیکن شاید شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے دل میں یہ خیال ہو کہ میں نے جناب تبریزی کا احترام کر کے ان کے عیب کو چھپانے یا اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ گواہ کو پیش کیا جائے۔

کہتے ہیں جب فاحشہ عورت گواہی کے لیے آپ کے سامنے لائی گئی تو اس پر آپ کی بزرگی و عظمت کا کچھ ایسا رعب طاری ہو گیا کہ وہ آپ کے قدموں میں گر پڑی اور اول سے لے کر تمام واقعہ اگل دیا۔ اور شیخ الاسلام کی تمام سازش طشت از بام کر دی۔ جناب تبریزی سے بڑی تعظیم و توقیر کے ساتھ معافی مانگی گئی اور نجم الدین کو شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔

لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد سلطان نے آپ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ آپ شیخ الاسلام کا عہدہ قبول فرمالیں۔ چنانچہ آپ نے یہ عہدہ قبول فرمالیا جو آپ کے خاندان میں طویل عرصے تک قائم رہا۔

بعضوں نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی اس ناپاک حرکت کے واقعہ کو جناب بختیار کاکی سے منسوب کیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہی صحیح ہو کیونکہ جناب کاکی کا اثر و نفوذ اور مقام و منصب دہلی والوں میں اتنا بلند ہو گیا تھا کہ نجم الدین صغریٰ جلنے لگا۔ یہی سبب ہے کہ جناب خواجہ معین الدین چشتی جب آپ سے ملنے دہلی تشریف لائے اور یہ حال دیکھا تو آپ سے فرمایا۔ بابا بختیار تمہارے یہاں رہنے سے کسی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ تم دہلی چھوڑ کر میرے ساتھ اجمیر چلے چلو۔ چنانچہ بابا اپنے مرشد کے ساتھ چلنے پر فوراً آمادہ ہو گئے۔ مگر اہل دہلی نے واویلا کر کے آپ کو رکوا لیا۔ ممکن ہے یہ واقعہ ان دونوں بزرگوں ہی کے نام سے منسوب ہو کیونکہ تاریخوں سے اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ جناب تبریزی، حضرت بختیار کاکی

سے ملنے کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ سلطان کی دعوت پر نہیں۔ بلکہ سلطان کو ان کے آنے کی بروقت اطلاع ملی تھی جس پر وہ آپ کے استقبال کو نکلے۔ اور جناب بختیار کاکی آپ کے استقبال کو علیحدہ بڑھے۔

(تصانیف)

جناب زکریا بہاؤالدین کی کسی تصنیف وتالیف کا حال تو معلوم نہیں۔ البتہ آپ نے اپنے مریدوں کو جو خطوط ووصایا تحریر کیئے وہ بمنزلہ آپ کے ملفوظات کے ہیں "اخبار الاخیار" میں مل سکتے ہیں۔ آپ نے ۶۶۱ھ تا ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار پر انوار ملتان ہی میں مرجع خلائق ہے۔

آپ کی اولاد میں شیخ صدرالدین عارف ایک ولی کامل کی حیثیت میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ والد محترم کی تمام خوبیاں۔ سخاوت وفیاضی آپ کی طبیعت اور مزاج میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ آپ نے اپنے والد گرامی قدر کے انتقال کے بعد تمام دولت ایک ہی دن میں فقیروں اور مسکینوں، محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دی۔ کسی نے اس پر آپ سے پوچھا کہ یا حضرت آپ کے والد ماجد تو اپنے خزانے میں نقد وجنس جمع رکھتے اور اسے تھوڑا تھوڑا خرچ کرنا پسند کرتے تھے مگر آپ نے تو اپنے لیے ایک دام بھی نہ رکھا۔ سب کچھ ایک ہی دن میں لٹا دیا۔ فرمایا۔ حضرت بابا دنیا پر غالب تھے۔ اس لیے دولت ان کے پاس جمع رہتی اور اس میں سے تھوڑا تھوڑا خرچ کرتے رہتے۔ مگر مجھ میں یہ خوبی پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے ڈر ہے کہ میں دنیا کے فریب میں نہ آجاؤں۔ اس لیے میں نے تمام دولت اپنے سے علیحدہ کر دی۔

ہمارے ہاں سہروردی سلسلہ جناب زکریا بہاؤالدین ہی سے پھیلا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہروردی سلسلے کے شیوخ کا اجمالاً تذکرہ پیش کر دیا جائے۔

شیخ ابوالنجیب سہروردی

ولادت:- ۴۹۰ سنہ ہجری۔ عراق کے ایک چھوٹے سے قصبے زنجان کے قریب

سہرورد نام ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ شجرہ نسب بارہ واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق سے جا ملتا ہے۔

آغاز جوانی میں سہرورد سے تحصیل علم کے لیے بغداد چلے آئے۔ جہاں امام اسعد المتوفی ۵۲۷ مدرس اعلیٰ مدرسہ نظامیہ بغداد سے فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کی تحصیل کی۔

علامہ ابوالحسن فصیحی النحوی المتوفی ۵۱۶ھ مدرس علم نحو سے علم ادبیہ کی تحصیل کی۔ اور کئی محدثین کرام سے علم حدیث کی تعلیم پائی۔

غرض تھوڑے ہی دنوں میں ایک متبحر عالم ہو گئے۔ اپنے ہم عصر علماء میں نہایت شہرت و ناموری پائی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ کے دل میں علوم باطنی کے حاصل کرنے کی لگن پیدا ہوئی۔

اگرچہ اپنے چچا شیخ وجیہ الدین ابوحفص عمر سہروردی کی صحبت میں بچپن ہی سے آپ کی طبیعت پر صوفیانہ رنگ تھا۔ اور آپ فقر و درویشی کی طرف مائل تھے۔ لیکن اب آپ کی عمر کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ بھی جوان ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ آپ نے درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے علوم باطنی کی تحصیل کے لیے پہلے اپنے عم محترم کی طرف رجوع کیا۔ ان سے فراغت پانے کے بعد امام محمد غزالی کے بھائی احمد غزالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے علم تصوف حاصل کیا اور منازل سلوک طے کیے۔

تذکرہ نویسوں نے بیان کیا ہے کہ آپ اپنے پیر بھائی محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں بھی پہنچے۔ اور ان سے بھی استفادہ کیا۔

منازل سلوک طے کرنے کے بعد آپ نے دین اسلام کی اشاعت و خدمت کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور درس و تدریس کا سلسلہ پھر سے جاری کیا۔

۵۴۵ھ میں آپ نے سلجوقی بادشاہ مسعود اور المقتفی امر اللہ عباسی خلیفہ کی خواہش پر مدرسہ نظامیہ بغداد کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آپ اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ مگر

۵۴۷ھ میں دو سال ہی کے بعد اس مدرسہ سے علیحدہ ہو گئے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بغداد کے مشہور کاتب شیخ یعقوب جو مدرسہ ہی میں رہا کرتے تھے۔ فوت ہو گئے۔ وہ چونکہ بے وارث تھے اس لیے حکومت کی طرف سے متعلقہ شعبہ کے افراد نے آکر ان کے سامان پر قبضہ کر کے تالا ڈالنا چاہا۔ طلباء مزاحم ہوئے۔ اس پر مدرسہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جناب شیخ اس ہنگامہ سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ عہدے ہی سے مستعفی ہو گئے۔

اس کے بعد آپ نے اپنا مدرسہ جو پہلے سے قائم تھا دوبارہ جاری کیا۔ جس میں فقہ وحدیث کے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے۔ مثلاً امام فخر الدین ابوعلی واسطی، قاضی ابوالفتوح تکوینی۔ علامہ کمال الدین ابن الانباری۔ علامہ ابن الغبیری۔ حافظ ابن عساکر۔ علامہ حافظ قاسم ابن عساکر، حافظ عبدالکریم سمعانی وغیرہ محدثین واکابرین آپ کے شاگردانِ رشید ہیں۔ غرض یہ کہ آپ کے چشمہ فیض وعرفان سے ایک عالم سیراب ہوا۔

طریقت کے علم میں بھی آپ کے اخلاص کیشان تصوف کی تعداد بے شمار ہے۔ جن میں سے چند مشہور مشائخ واولیائے کرام یہ ہیں۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ عبداللہ مطروحی، شیخ جمال الحق والدین عبدالصمد زنجانی، خواجہ اسمٰعیل قیصری وغیرہ ہم صوفیا واکابر اولیائے کرام آپ ہی کے مریدین خاص اور آپ کے خلفائے بااخلاص ہیں۔

آپ کا سلسلہ طریقت سہروردیہ کے نام سے تمام عالمِ اسلام میں پھیلا اور خوب پھیلا۔ جناب شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ مولانا فخر الدین عراقی۔ حضرت امیر حسینی سادات مولانا جلال الدین رومی، جناب خواجہ فرید الدین عطار، مولانا شمس الدین تبریزی۔ شیخ الاسلام سید نور الدین مبارک غزنوی، مولانا مغربی، مخدوم جہانیاں سید السادات مخدوم جلال الدین بخاری، خواجہ نجیب الدین فردوسی۔ مولانا شمس الدین تبریزی اور شیخ الاسلام جناب غوث زکریا بہاؤ الدین ملتانی وغیرہ ہم بزرگانِ دین آپ ہی کے سلسلہ سہروردیہ کے مشائخ اعلام ہیں۔

نظام الدین محبوب الٰہی

اسمِ گرامی:۔ سید محمدؒ المعروف سلطان المشائخ

آپ کے باپ دادا کسی زمانے میں بخارا سے نکل کر بدایوں آ رہے۔ جہاں ۶۳۶ھ سلطان التمش کے زمانے میں آپ کی ولادتؒ باسعادت ہوئی۔

آپ ابھی پانچ برس کے تھے کہ آپ کے والد محترم جناب مولانا سید احمد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور آپ یتیم ہو گئے۔

آپ کی والدہ محترمہ سیدہ بی بی زلیخا ایک سمجھ دار اور دین کی تعلیمات سے واقف خاتون تھیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش و تربیت کا بار تنہا سیدہ ہی نے اٹھایا انہوں نے آپ کو ابتدائی تعلیم دی اور آپ کے دل میں دین کی اشاعت کے حصول کا شوق پیدا کیا۔

بی بی زلیخا سوت کاتتی اور اس سے جو معاوضہ میسر آتا اس سے گھر کے اخراجات چلاتی تھیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کئی روز فاقے سے گزر جاتے۔ لیکن جناب نظام الدین باوجود نہایت کم سن ہونے کے کیا مجال جو لب پر ایک حرف بھی شکایت کا لے آتے۔ بلکہ صبر و تحمل اور حوصلے کے ساتھ علوم دین کی تحصیل میں لگے رہتے۔

جس روز کھانے پینے کو گھر میں کچھ نہ ہوتا۔ بی بی کہتیں۔ بابا نظام آج ہم اللہ میاں کے مہمان ہیں۔ بھولا بھالا نظام بھی اس مہمانی کا اتنا قدر دان تھا کہ ہمیشہ اس کے دل میں یہی

خیال رہتا کہ وہ دن کب آئے گا جب اماں پھر کہیں گی - بابا نظام آج ہم اللہ میاں کے مہمان ہیں۔

ماں کی اس خاص توجہ اور تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ سولہ برس ہی کی عمر میں تمام علوم دین میں کامل ہو گئے۔ تفسیر، حدیث، فقہ پر انہیں دسترس ہو گئی۔

تعلیم سے فراغت پائی تو والدہ محترمہ نے تمام شہر کے علماء و فضلا کو جمع کیا اور اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے سوت کی آپ کے سر پر پگڑی بندھوائی۔

اس کے بعد مزید تحصیل باطنی کے لیے آپ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو لے کر بدایوں سے دہلی آ گئے۔ جہاں آپ کو شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا خوارزمی اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ سلطان بلبن ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔

خواجہ صاحب دہلی میں ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے ایک حجرے میں رہا کرتے تھے ان کے قریب ہی خواجہ فریدالدین گنج شکر کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل رہتے تھے آپ اکثر ان کے مکان پر جایا کرتے تھے۔ اور ان کی زبانی آپ کو جناب فریدالدین گنج شکر کے فیض باطنی و کمالات علمی کا حال معلوم ہوا۔

آپ کو ان سے ملاقات کرنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ خواجہ فریدالدین گنج شکر سے ملاقات کرنے کے لیے پاکپٹن روانہ ہوئے۔ جب آپ بابا صاحب کی خدمت میں پہنچے تو بابا صاحب نے آپ کو دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا اور گلے سے لگا لیا۔ آپ ایک مدت تک ان کے پاس رہے۔ ان سے بیعت کی اور خرقہ خلافت پایا۔

ان دنوں بابا کے لنگر میں بڑی تنگدستی تھی۔ آپ کے درویش کیا کرتے کہ اپنے حصے کا ایک کام لے لیتے اور اس کو سرانجام دیتے۔ چنانچہ مولانا بدرالدین اسحٰق لنگر خانہ کے لیے جنگل سے ایندھن لاتے۔ شیخ جمال الدین ہانسوی ایک جنگلی پھل ڈیلا اچار بنانے کو لاتے۔ حسام الدین کابلی پانی بھرتے اور برتن صاف کیا کرتے۔ اور خواجہ صاحب کے ذمے کھانا پکانے اور کھلانے

کا کام تھا ۔ کہتے ہیں ایک روز کھانے میں نمک کی کمی تھی۔ آپ بازار گئے اور کسی بنیے سے ادھار پر نمک لے آئے ۔ بابا صاحب کو جب معلوم ہوا تو لقمہ سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا :-

از یں بوئے اسراف مے آید

آپ نے عرض کیا قرض کا نمک آیا ہے ۔ بابا نے فرمایا :- درویشوں کے لیے قرض سے موت بہتر ہے ۔ اگر کسی مقروض درویش کو اچانک موت آجائے تو قیامت میں اس کی گردن جھکی رہے گی ۔ خواجہ صاحب نے اسی وقت کانوں کو پکڑ لیا اور آئندہ قرض لینے سے توبہ کی ۔ بابا صاحب نے خدا کی بارگاہ میں آپ کے لیے دعا کی :- کہ اے پروردگار یہ تجھ سے جو کچھ مانگا کرے اسے عنایت کر دیا کر ۔ بابا کی یہ دعا قبول ہوئی ۔ اسی لیے جناب نظام الدین کو محبوبِ الٰہی کہا جاتا ہے ۔

آخری مرتبہ جب آپ دہلی سے پاکپٹن اپنے مرشد جناب بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی زیارت کو گئے تو آپ کو بابا صاحب نے پھر ایک دعا دی ۔ فرمایا نظام الدین اللہ تعالےٰ تمہیں نیک بخت بنائے ۔ انشاء اللہ تعالےٰ تم ایک ایسے درخت ہو گے جس کے سائے میں اللہ تعالےٰ کی مخلوق آرام پائے گی ۔

چنانچہ بابا صاحب کی یہ دعا اور پیشین گوئی بھی آپ کے حق میں حرف بحرف پوری ہوئی ۔ اولیائے کرام کی فہرست میں شاید ہی کوئی ایسا ولی نظر آئے ۔ جس کے قرب و صحبت کی بادشاہوں تک نے آرزو کی ہو ۔

آپ کے لنگر خانہ کا عالم یہ تھا کہ سینکڑوں غریب و مسکین ، لولے لنگڑے اور اپاہج کھانا کھاتے ۔ ان کے علاوہ باہر سے جو سیاح آتے انہیں بھی یہاں آرام میسر آتا ۔ اور وہ مہینوں آپ کے مہمان رہتے ۔ اور سینکڑوں اشرفیاں اور زادِ راہ لے کر واپس جاتے ۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ جب تمام لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے تب اپنا کھانا منگواتے اور تناول فرماتے ۔ آپ نے عمر بھر کبھی مرغن اور عمدہ غذا نہیں کھائی ۔ عموماً جو کی روٹی اور ابلی ہوئی ترکاری ہوتی ۔ کبھی رو پڑتے اور فرماتے جی نہیں چاہتا کہ اللہ کے ہزاروں بندے مسجدوں

بازاروں اور گھر کے کونوں گوشوں میں بھوکے پیاسے پڑے ہوں اور مزے مزے کی چیزیں کھاؤں - سردی کے دنوں میں فرماتے بارالہا کس غضب کی سردی ہے - غریب لوگ تیرے عاجز بندے کس طرح برداشت کر رہے ہوں گے -

ایک مرتبہ ایک شخص کے مکان کو آگ لگ گئی - لوگ اس کی مدد کو دوڑے آپ بھی لوگوں کے ساتھ آگ بجھانے کو دوڑے - آتش زنی سے اس غریب کا بڑا نقصان ہوا - آپ کو اس کی بربادی پر سخت قلق ہوا - آپ نے خادم سے فرمایا - لنگر سے اس کے بیوی بچوں کے لیے کھانا لے جاؤ - اور اتنی رقم بھی دے آؤ جس سے اس کی ضروریات آسانی سے پوری ہوجائیں -

شان کی بے پروائی یہ تھی کہ اکثر بادشاہوں کو آپ سے میل جول بڑھانے کی تمنا رہتی وہ چاہتے کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں - غیاث الدین بلبن کے پوتے معزالدین کیقباد کو آپ سے دلی محبت تھی - اس نے اسی سبب سے آپ کے مسکن کے قریب ہی اپنا محل تعمیر کرایا - اور اس میں سکونت اختیار کی - لیکن آپ اس کی تعمیر کی ہوئی مسجد میں جانے کے سوا کبھی اس کے پاس نہیں گئے -

کیقباد کے بعد جب جلال الدین خلجی کا زمانہ آیا تو اس نے بھی آپ کے قرب کی خواہش کی لیکن آپ نے منظور نہ کیا - اس کے بعد علاؤالدین خلجی آیا تو اس نے بھی آپ کو نہایت قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا - وہ آپ کے اشعار کو کئی مرتبہ پڑھتا - اور زار و قطار رونا جاتا - علاء الدین کو بھی آپ کے قرب کی حسرت ہی رہی - مگر اس نے اس آرزو کی خواہش میں اپنے ولی عہد خضر خاں اور چھوٹے بیٹے شادی خاں کو آپ کی مریدی میں دے دیا -

علاء الدین کے مرنے کے بعد سلطنت کے احوال میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ خضر خاں تاجدار ہند نہ بن سکا - علاء الدین کے تیسرے بیٹے قطب الدین خاں نے سلطنت اپنے زیر نگیں کر لی - اور اپنے بڑے بھائی خضر خاں کو پہلے اندھا کر دیا پھر اپنے دوسرے

بھائی شادی خاں سمیت اسے قتل کر دیا۔

قطب الدین ایک ناتجربہ کار اور نوعمر بادشاہ تھا۔ اسے یہ دیوانگی ہوگئی کہ وہ کسی طرح لوگوں کے دلوں سے آپ کی عظمت مٹا دے۔ چنانچہ اس نے بزورِ شمشیر اس ناپاک ارادے میں کامیاب ہونے کی کوشش کی۔ اس نے آپکو اپنے دربار میں بلانے کے لیے حکم دیا کہ تمام علماء و فضلاء کی طرح سلام کی غرض سے آپ بھی میرے حضور میں پیش ہوا کریں۔ آپ نے اسے کہلا بھیجا کہ بادشاہوں سے ملنے کا ہم فقیروں کا دستور نہیں! قطب الدین اس جواب پر بڑا سیخ پا ہوا اور کہا کہ اگر وہ نہ آئیں گے تو میں زبردستی بلاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اس مہینے کے فلاں دن مجھ سے ملاقات کریں۔ آپ کو یہ اطلاع ہوئی تو فرمایا میں اپنی ذاتی رائے بدل سکتا ہوں۔ لیکن بزرگوں کے طریقے کو نہیں بدل سکتا۔

قدرت خدا کہ جب وہ مقررہ دن آیا تو یکایک شور و غل ہوا کہ سلطان قطب الدین مارا گیا۔ قطب الدین اپنے ایک حسین و جمیل نوخیز غلام خسرو پر ہزار جان سے فدا تھا۔ اس نے اپنی حکومت قائم کرنے کی آرزو میں موقع پاکر قتل کر دیا۔ اور ہزار ستون کی چھت پر اس کا سر کاٹ کر نہایت ذلت و حقارت سے نیچے پھینک دیا۔

خسرو خاں ایک نومسلم رعایا کا ہندو بچہ تھا۔ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ کہ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کا زمانہ آیا۔ غیاث الدین تغلق خسرو کو ٹھکانے لگانے کے بعد امور سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ اراکین حکومت نے اسے ایک مذہبی مجلس قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی جس میں دین کے مسائل پر آپس میں تبادلہ خیالات ہوا کرے۔ چنانچہ یہ مجلس قائم ہوئی اور اس میں سب سے پہلے سماع کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اور جناب نظام الدین محبوب الٰہی کو دعوت دی گئی۔ آپ اس مجلس میں تشریف لے گئے اور اس مسئلہ پر ایک ایسی مدلل اور پرمغز تقریر فرمائی۔ کہ شرارت کرنے والوں کے تمام ارادوں پر پانی پھر گیا۔ بادشاہ بے حد خفیف ہوا اور شرمندہ ہو کر بنگالہ کی مہم پر چلا گیا۔

ایک مدت کے جب وہ مہم سے فراغت پاکر دہلی کی طرف روانہ ہوا تو اس نے آپ کو یہ کہلا بھیجا کہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے پہلے شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہنوز دلی دور است ۔ کہتے ہیں اس نے آپ کو کئی دفعہ پیغام بھیجا۔ اور آپ نے ہر مرتبہ یہی جواب ارشاد فرمایا۔

غیاث الدین تغلق کے ولی عہد نے باپ کے استیصال کے لیے بڑی بڑی دھوم دھام سے تیاریاں کیں۔ شہر کی آبادی سے دو میل کے فاصلے پر ایک چوبی محل تیار کیا۔ جب تغلق وہاں پہنچا اور اسی محل میں اس کی شاندار دعوت کی۔ تو عین اس وقت کہ جب تمام لوگ کھانا کھا چکے اور باہر آگئے اور یہ اپنے چند مقربین کے ساتھ ابھی محل ہی کے اندر تھا۔ قدرت خدا کہ یکایک محل کی چھت گر گئی اور سلطان مع اپنے مقربین کے اس میں دب کے مر گیا۔

تغلقوں کے بعد جب مغلوں کا زمانہ آیا۔ انہوں نے آپ کی توقیر و عظمت تمام بادشاہان ہند میں سب سے بڑھ چڑھ کر کی۔ ان کی اکثر یہ خواہش رہی کہ آپ ان کے ہدیے اور نذرانے قبول فرمائیں۔ اکثروں نے آپ کے متعلقین اور عزیزوں یا رشتہ داروں کو بیچ میں ڈالا۔ اور سفارشیں کروائیں۔ اور کہا کہ اگر آپ اپنے لیے کچھ نہیں لیتے تو لنگر خانہ کے لیے ہی کچھ قبول کر لیں۔
آپ نے مکدّر طبیعت سے کہا:۔ ہم فقیروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم جاگیردار بنیں۔ ضرورتوں کا تو پورا کرنے والا صرف وہی کارساز ہے۔ اور میں نے اس پر توکل کیا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی اولاد نے بھی آپ کے بعد اسی نظریے پر عمل کیا۔ مغلوں نے کئی مرتبہ بڑی بڑی جاگیریں اور دیہات دینے چاہیں لیکن انہوں نے کبھی قبول نہ کیے۔

۸۲۵ھ کو آپ کو مرض الموت لاحق ہوا۔ آپ نے حکم دیا کہ گھر میں جو کچھ ہے وہ سب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد لنگر خانے کے مہتمم کو بلا کر فرمایا کہ باورچی خانے میں اس وقت جتنا بھی اناج اور غلہ محفوظ ہے وہ اسی وقت کھڑے کھڑے سب کا سب تقسیم کر دو۔ یہاں تک کہ ایک دانہ باقی نہ رہے۔

وصال کے دنوں آپ کو بار بار غش پڑتا جب ہوش میں آتے تو یہی سوال کرتے ۔ نماز کا وقت ہوا؟ کوئی مسافر آیا؟ اگر آیا ہے تو اس کی خاطر مدارت اور تواضع کرو۔ نماز کا وقت آیا ہے تو مجھے بٹھاؤ اور نماز پڑھاؤ۔ اللہ اللہ یہ شان تھی بزرگانِ دین کے شرعی محافظ ہونے کی ۔ اور یہی وہ ان بزرگوں کی کرامت ہے کہ جس کے سبب آج تک ان کا نام زندہ ہے ۔ اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عظمت قائم ہے ۔ اور یہ ان بزرگوں کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج چمن اسلام سرسبز و شاداب ہے ۔

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ کے دسترخوان پر کئی کئی ہزار لوگ کھانا کھاتے تھے ۔ مگر لوگ حیران تھے کہ اتنا روپیہ آپ کے پاس کہاں سے آتا ہے ۔ اور جب وہ یہ دیکھتے کہ نذر و نیاز کی رقمیں بھی آپ اپنے پاس نہیں رکھتے ۔ بلکہ اسی وقت فقیروں میں بانٹ دیتے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہتی ۔

ایک مرتبہ علاء الدین خلجی نے آپ کی خدمت میں پانسو اشرفیاں نذر بھیجیں ۔ اس وقت ایک فقیر آپ کے پاس بیٹھا تھا ۔ اس نے کہا بابا اس میں سے نصف میرا ہے ۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ سب تمہارا ہے ۔ اور یہ کہہ کر تمام اشرفیاں اسے دے دیں ۔

مستحقین میں دولت کو تقسیم کرنا تو خیر آپ جانتے ہی تھے ۔ کہ یہ انہی کا حصہ ہے ۔ مگر ایک بات ایسی بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ جس سے آپ کے اخلاق حمیدہ اور عالی ظرف ہونے کا بہ ایک اندازہ ہوتا ہے ۔ کہتے ہیں ایک شخص آپ کو گالیاں دیتا ۔ اور آپ اسے دو اشرفیاں دیتے ۔ ایک دن لوگوں نے اسے غیرت دلائی ۔ تو اس نے آپ کو گالیاں دینا ترک کر دیا ۔ اور وعدہ کیا کہ میں اب آپ کی شان کی گستاخی نہیں کروں گا ۔ چنانچہ جب اس روز وہ آپ کی خدمت میں گیا تو چپ رہا ۔ مگر جب چلنے لگا تو اپنا وظیفہ مانگا ۔ آپ نے فرمایا بھائی میرا حق بھی دے دو ۔ کہتے ہیں ایک مدت کے بعد جب اس کا انتقال ہوا اور آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ اس کی قبر پر گئے ۔ اور یہ دعا کی ۔ اے پروردگار اس شخص کو بخش دے میں نے اس کی غلطیوں کو بخش دیا ۔

آپ نے ۷۲۵ ہجری میں انتقال فرمایا۔ آپ سے حسن عقیدت وارادتمندی رکھنے والے مسلمان نظامی کہلاتے ہیں۔ اور وہ آج ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

تصانیف

آپ کے وہ ملفوظات جن کی حیثیت آپ کی تصنیفات کی ہے۔ یہ ہیں:-

(۱) فوائد الفواد۔ (۲) افضل الفوائد۔ (۳) راحت المحبین

امیر خسرو: خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے مریدانِ عقیدت کیش میں جو اپنے مرشد کے نام کے شیدائی نہیں دیوانے تھے۔ جناب امیر خسرو سرِ فہرست ہیں آپ ۶۵۱ھ میں ضلع ریٹہ کے ایک چھوٹے سے قصبے پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ بعضوں نے آپ کی جائے ولادت پٹیالہ تحریر کی ہے۔ جو شاید سہو کتابت ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی فضیلت و کمال شاعری میں بعض لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جناب شیخ سعدی شیرازی ایسے بزرگ آپ سے ملنے کے لیے ایران سے ہندوستان آئے۔ اگر ان ہر دو بزرگوں کے سنین ولادت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسنِ عقیدت نے حدِ اعتدال سے بڑھ کر واقعہ میں غلو و مبالغہ آرائی کی ہے۔

مولانا حالی تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر تذکرہ نویسوں کو شبہ ہوا ہے اور جناب شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب، جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی جناب امیر سے ملنے کو شیراز سے ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن اس واقعہ کا کچھ ثبوت نہیں۔ بلکہ شیخ سعدی اور امیر خسرو کے زمانے کا مقابلہ کرنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جناب شیخ کا امیر خسرو سے ملاقات کے لیے آنا قطعاً خلافِ قیاس ہے۔

خسرو کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہوئی ہے۔ جبکہ شیخ سعدی کی عمر ۷۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب اگر بفرضِ محال امیر خسرو کی شہرت پچیس ۲۵ برس ہی کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی ہو تو اس وقت شیخ سعدی کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کیونکر خیال میں آسکتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یگانۂ روزگار اور مقبول عام و خاص ہو۔ ایک پچیس برس کے نوجوان کی شہرت سن کر ایران سے ہندوستان آئے۔

البتہ معتبر حوالوں سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے قاآن محمد سلطان، ناظمِ ملتان نے جسے خان شہید کہتے ہیں۔ جناب شیخ سے دوبارہ درخواست کی کہ آپ شیراز سے یہاں تشریف لائیں۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں

ہیں تھے۔ اس لیے ان کا کلام بھی جناب شیخ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ بھیجا گیا۔

جناب شیخ اس وقت بہت معمر ہو چکے تھے۔ اس لیے خود تو نہ آ سکے مگر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے دو دیوان خان شہید کو بھیجے اور جناب امیر خسرو کے بارے میں تحریر فرمایا کہ اس جوہر قابل کی تربیت و حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

مولانا شبلی نے امیر خسرو کا سن ولادت ۶۰۵ ہجری بیان کیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ۶۸۸ھ میں آپ چھتیس ۳۶ برس کے تھے۔ حالانکہ اس حساب سے اس وقت آپ کی عمر ۸۳ برس کی ہونی چاہیے۔ پھر آگے چل کر آپ کی بیعت کا حال بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ بیالیس ۴۲ برس کی عمر میں امیر خسرو نے جناب محبوب الٰہی کے دست حق پرست پر بیعت کی۔

امیر خسرو کی ولادت سے متعلق اگر مولانا کا یہ بیان درست مان لیا جائے تو بعد کے دونوں بیان غلط ثابت ہوں گے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ مولانا کی غلطی نہیں سہو کتابت ہوگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعضوں نے واقعہ ملاقات کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ اور اس پر اصرار کیا ہے تو لامحالہ پھر کہنا پڑتا ہے کہ شاید مولانا شبلی مرحوم بھی یہی خیال کرتے ہوں گے کہ ولادت خسرو ۶۰۵ھ میں ہوئی۔

جناب شیخ سعدی ۵۸۹ھ یا ۵۷۹ھ یعنی چھٹی صدی ہجری کے شروع میں پیدا ہوئے اس اعتبار سے ہر دو بزرگوں کی عمروں میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کو تسلیم کرنے میں پھر کوئی عذر باقی نہیں رہتا کہ جناب شیخ سعدی یقیناً ہندوستان تشریف لائے اور جناب امیر خسرو سے ملاقات کی۔

جناب امیر خسرو جس زمانے میں پیدا ہوئے وہ غیاث الدین بلبن کا عہد حکومت تھا۔ جب پہلی مرتبہ آپ کو بلبن کے دربار میں بلایا گیا اس وقت آپ بہت ہی کم عمر تھے۔ دوسری مرتبہ جس وقت پھر بلائے گئے۔ اس وقت بھی آپ فن شاعری کے لحاظ سے بلندی سے آگے نہیں بڑھے تھے۔

یہ بات کیسے معلوم نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ ہی طبیعت میں پختگی آتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ عہد بلبن تک آپ نے شاعری میں ابھی کوئی مقام حاصل نہیں کیا۔ اس کے بعد خلجیوں کا دور آیا اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ اگر ولادت خسرو کا واقعہ ہونا بلبن ہی کے عہد حکومت میں صحیح ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ۶۵۵ھ کو ولادت خسرو کا صحیح سن ولادت مان لیا جائے

وجہ تسمیہ امیرؔ:- جلال الدین خلجی ایک علم دوست اور ادب نواز حکمران تھا اس لیے اپنے عہد حکومت میں خسرو کو اپنا مصاحب خاص مقرر کیا۔ اور مصحف داری (قرآن مجید رکھنے) کی خدمت تفویض کی۔ اس کے صلے میں خسرو کو لباس خاص عطا ہوا اور ایک معقول مشاہرہ بھی ملا اس کے علاوہ امارت کا عہدہ بھی دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لباس بھی عنایت کیا گیا جو امرائے خاص کے لیے مخصوص تھا۔ پس اسی وجہ سے آپ امیر کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

سنہ ۶۹۴ھ میں جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے علاء الدین خلجی کے ہاتھوں دھوکے سے قتل ہو گیا۔ اور زمام حکومت علاء الدین کے ہاتھ آ گئی۔ اگرچہ یہ شخص بڑا ظالم وسفاک اور بے رحم تھا لیکن اس کے باوجود وہ حیرت انگیز حد تک نہایت علم دوست اور قدر شناس تھا۔ اس کے دربار میں علماء، فضلاء، ادباء و شعراء جمع رہتے اور ان میں امیر خسرو کی حیثیت یوں تھی جیسے کالبدر فی النجوم یعنی ستاروں میں چاند۔

مولانا شبلی کہیں تو لکھتے ہیں کہ امیر خسرو کے والد محترم جناب امیر لوسیف الدین محمود نے انہیں آٹھ برس کی عمر میں خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی کے قدموں میں لاکر ڈال دیا اور خیر و برکت کے لیے بیعت کرادی۔ اور کہیں لکھا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت خسرو صرف سات سال کے تھے۔

صحیح یہ ہے کہ جناب امیر خسرو غالباً سنہ ۶۹۴ھ بیالیس؟ سال کی عمر میں جناب خواجہ کے حلقہ بگوش ارادت ہوئے۔ اور آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ معلوم نہیں یہ واقعہ

کہاں تک درست ہے ۔ بہر کیف تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اول اول جب آپ جناب خواجہ کی خدمت میں چلے ہیں اور ان سے بیعت کرنے کا ارادہ کیا ہے تو خواجہ کے دروازے پر پہنچ کر بجائے اندر جانے کے چوکھٹ پر بیٹھ گئے ۔ اور دل میں یہ سوچنے لگے کہ اگر خواجہ ولی کامل ہیں تو اپنے کشف سے میرے اس قطعہ کے جواب میں کچھ ارشاد فرمائیں ۔

تو آں شاہے کہ بر ایوان قصرت
کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر در آمد
بیاید اندروں یا باز گردد

ترجمہ :۔ آپ وہ بادشاہ ہیں کہ جن کے محل کی چھت پر اگر کبوتر آکر بیٹھ جائے تو باز بن جائے ۔ ایک غریب حاجت مند آپ کے دروازے پر حاضر ہوا ہے کہیے اندر چلا آئے یا واپس لوٹ جائے ۔

جناب خواجہ نے اپنے کشف روحانی سے یہ بات معلوم کر لی ۔ اور اپنے ایک خادم سے فرمایا ۔ جاؤ ایک ترک زادہ باہر بیٹھا ہے ۔ اس کے سامنے یہ شعر پڑھ دو اور واپس چلے آؤ ۔

بیاید اندروں مرد حقیقت
کہ با ما یک نفس ہم راز گردد
اگر ابلہ بود آں مرد ناداں !
ازاں راہے کہ آمد باز گردد

ترجمہ :۔ مرد حقیقت اندر چلا آئے ۔ تاکہ ہم کچھ وقت آپس میں راز و نیاز کی باتیں کر لیں ۔ اور اگر مرد ناداں و بے وقوف ہے تو جس راستے سے آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے ۔

امیر خسرو خادم کی زبان سے آپ کے یہ فی البدیہہ شعر سن کر بیتابانہ دوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اور آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ اور ان کے مرید ہو گئے ۔ یوں تو خسرو کی فطرت کا خمیر روز ازل ہی سے عشق و محبت کی چاشنی سے گوندھا ہوا تھا لیکن مرشد کی صحبت نے آپ کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرمست و شیدائی بنا دیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ دیارِ محبت کا شیدائی بنا دیا۔ آپ ہر وقت اور ہر لمحہ سایے کی طرح خواجہ کے ساتھ ساتھ رہتے تھے ۔ گویا جناب خواجہ کا جمال پُر جلال دیکھ دیکھ کر جیتے تھے ۔ اور جناب خواجہ کو بھی اپنے مرید خسرو سے ایسا ہی دلی تعلق تھا ۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہو گا کہ نظام الدین کیا لایا ہے ؟ تو جواب میں خسرو کو پیش کر دوں گا ۔ دعا مانگتے تو خسرو کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے ع

الٰہی بہ سوز سینہ ایں ترک مرا بہ بخش ۔

ترجمہ :۔ اے اللہ اس ترک کے سوز و دروں کے طفیل مجھے بخش دے ۔

جناب خواجہ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تو ملنے والوں کو روک دیا جاتا ۔ لیکن خسرو کے لیے بلا تامل چلے آنے کی اجازت تھی ۔ خسرو روزانہ آپ سے خواب گاہ میں ملنے آتے ۔ اور آپ کے پہلو میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے ۔ کہ اتنے میں آپ کی آنکھ لگ جاتی ۔ اور یہ بھی پہلو سے اٹھتے اور خواجہ کے قدموں پر سر رکھ کر سو جاتے ۔

ایک مرتبہ کئی مہینوں سے یہ صحبت ترک رہی مگر جب پھر سے جاری ہوئی تو خسرو نے یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا ۔

نخفت خسرو مسکین ازیں ہوس شبہا

کہ دیدہ بر کف پایت نہد بخواب شود

ترجمہ :۔ خسرو غریب اس تمنا میں کئی راتیں نہ سویا کہ حضور کے تلووں پر آنکھ

رکھ کر سوئے۔ خواجہ فرمایا کرتے کہ اگر شریعت اجازت دیتی تو میں اور خسرو ایک ہی قبر میں رہتے۔ آپ خسرو کو ترک اللہ کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ترک معشوق کا لقب تھا خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

گر برائے ترک ترکم ارّہ بر تارک نہند
ترک تارک گیرم و ہرگز نگیرم ترکِ ترک

ترجمہ:۔ اگر میری پیشانی پہ آرہ رکھ دیا جائے۔ اور کہا جائے کہ اپنے ترک کو چھوڑ دو۔ تو میں اپنی پیشانی کو چھوڑ دوں گا۔ مگر اپنے ترک کو نہ چھوڑوں گا۔

ایک مرتبہ جناب خواجہ کی خدمت میں ایک بھوکا ننگا سائل حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ کچھ عنایت فرمائیے۔ میں بہت غریب و محتاج ہوں۔ خواجہ اٹھے اور اپنی جوتیاں اٹھا کر اس کے حوالے کیں۔ وہ لے کر چل دیا۔ اتفاق سے ایک سرائے میں امیر خسرو مع اپنے خدم وحشم اور لاؤ لشکر کے ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہیں یہ بھی ادھر جانکلا۔ امیر خسرو اپنے خادموں سے کہنے لگے ...... بوئے شیخ می آید۔" خادموں نے اشارہ پاتے ہی تلاش کی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ اس سرائے میں ایک سائل ٹھہرا ہوا ہے۔ اور وہ خواجہ کے دربار سے ہو کر آیا ہے۔ سائل بلایا گیا پوچھتے ہی اس نے بتایا کہ میں کافی دیر تک جناب خواجہ کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ لیکن ان دو جوتیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ امیر خسرو نے کہا۔ لاؤ یہ جوتیاں مجھے دے دو۔ اور اس کے عوض یہ تمام ساز و سامان، مال و متاع۔ خدم وحشم مجھ سے لے لو۔ وہ بولا۔ آپ تو مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ آپ نے کہا۔ نہیں میں تم سے بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ غرض یہ جوتیاں لے کر جناب خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا۔ آپ نے ہنس کر فرمایا خسرو! یہ جوتیاں تم نے بڑی سستی خریدیں ہیں۔

اس واقعہ کی نوعیت خواہ کیسی ہو لیکن اس سے یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ جناب خسرو کو اپنے پیر و مرشد جناب خواجہ محبوب الٰہی سے کس قدر محبت، انس اور والہیت تھی۔

جناب خسرو اپنے پیر و مرشد جناب خواجہ محبوبِ الٰہی کے انتقال کے وقت بنگالے میں تھے ۔ آپ کی وفات کا سانحہ ناگزیر والمناک سن کر وہاں آئے ۔ اور جس وقت اس جگہ پہنچے ۔ جہاں ان دنوں جناب خواجہ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے ۔ تو آپ نے یہ دوہا پڑھا ۔

ؔ گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر دارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چو ندیس

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ دوہا کہہ کر آپ نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور اسی وقت قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی ۔

شیخ محمد میر المعروف میاں میر صاحبؒ

ولادت:- سنہ ۹۳۸ھ یا سنہ ۹۵۷ھ میں سہوان (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم قاضی سائیں دتہ فاروقی تمام سندھ میں نہایت معزز و ممتاز بزرگ شمار کیے جاتے تھے۔ تحفۃ الکرام میں لکھا ہے کہ قاضی سائیں دتہ حضرت عمر فاروق کی اولاد سے تھے۔ اور اپنے وقت کے ممتاز و متبحر علمائے اسلام میں سے تھے۔

آپ کا اسم گرامی شیخ محمد میر تھا۔ مگر میاں میر کے نام سے شہرت پائی۔ آپ ابھی بارہ برس کے تھے کہ آپ کے والد گرامی قدر انتقال فرما گئے۔ آپ کی والدہ محترمہ ایک صاحب علم و عمل خاتون تھیں۔ آپ نے انہیں سلسلہ قادریہ کے سلوک سے روشناس کرایا اور تعلیم دی اس کے بعد آپ قادری سلسلے کے ایک نامور بزرگ جناب شیخ سیوستانی کے مرید ہو گئے۔

آپ ایک طویل عرصے تک جناب شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب آپ کی عمر پچیس برس کی ہوئی تو آپ جناب شیخ کی اجازت سے لاہور آ گئے۔ یہ اکبر کی حکومت کا زمانہ تھا۔ ان دنوں لاہور میں جناب مولانا سعد اللہ درس قرآن حکیم دیا کرتے۔ آپ ان کے درس میں شامل ہو گئے۔ اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ چند سال مفتی عبدالسلام لاہوری سے بھی اکتساب علم کیا۔

تکمیل علوم ظاہری و باطنی کے بعد آپ نے خلق خدا کی اصلاح و تبلیغ کا سلسلہ جاری

کیا۔ جس سے تھوڑی ہی مدت میں تمام لاہور میں آپ کی شہرت پھیل گئی۔ آپ کو نام ونمود اور شہرت سے چونکہ سخت نفرت تھی اس لیے چند روز کے لیے لاہور سے عازم سرہند ہو گئے۔ ایک سال سرہند میں قیام کرنے کے بعد آپ لاہور میں واپس تشریف لے آئے۔ اور پھر آخر عمر تک یہیں رہے۔ جس مقام پر آپ نے قیام کیا۔ اسے محلہ باغبان کہتے ہیں جسے ان دنوں خانپورہ بھی کہتے ہیں۔

آپ نے سرہند سے واپس آکر درس وتدریس کا سلسلہ پھر سے جاری کیا اور ایسے شاگردوں کی تعداد تیار کی جنہوں نے اسلام پھیلانے میں بڑا نمایاں کام کیا۔

آپ اپنے مریدوں اور شاگردوں پر خاص توجہ فرماتے۔ ان کی اصلاح فکر اور تہذیب نفس کو مقدم جانتے تھے۔ اور یہ کام چونکہ بڑا سخت ہے اس لیے آپ کسی کو اپنا مرید نہیں بناتے تھے۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جو شخص آپ کو ملنے کے لیے حاضر ہوتا۔ آپ اس سے بڑی خوش خلقی اور خنداں پیشانی سے پیش آتے۔ اور ان کے حال پر اتنی شفقت فرماتے کہ اسے اس کا سو فیصدی پورا یقین ہو جاتا۔ کہ آپ صرف میرے حال پر ہی کرم فرماتے ہیں۔

لیکن اپنے مریدوں کے احوال پر خاص کر کڑی نظر رکھتے۔ ان سے اگر کوئی خلاف شریعت کام ہو جاتا تو انہیں سختی سے منع کرتے۔ اور آئندہ کے لیے تنبیہ فرما دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے مرید وخلیفہ ملا خواجہ بہاری نے آپ کی خدمت میں ایک واقعہ عرض کیا۔ بہاری نے کہا ایک روز کچھ لوگ میرے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مکان گر جانے کے آثار پیدا ہوئے۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ فوراً باہر چلے جاؤ۔ سب لوگ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ لیکن میں وہیں جم کے بیٹھا رہا۔ اور با آواز بلند کلمہ طیب پڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ چھت گری اور دو لکڑیاں آپس میں اس طرح ملیں جن کے درمیان میں سلامتی کے ساتھ بیٹھا ہوا ورد کر رہا تھا۔ جب آپ نے یہ واقعہ سنا تو آپ نے خواجہ بہاری سے کہا:۔ ہائے مرتبہ، ہائے مرتبہ۔ آپ نے خواجہ بہاری سے کہا کیا تم نے کلمہ طیب کو بلند آواز سے اس لیے پڑھا کہ لوگوں کے دل میں تمہارا

درویشی کی قدر و قیمت پیدا ہو جائے اور لوگ تمہارے بارے میں یہ کہیں کہ کتنا بڑا درویش ہے کہ مرتے وقت بھی خدا کو یاد کرتا رہا۔ تمہیں چاہیے تھا کہ بلند آواز سے پڑھنے کی بجائے آہستہ آہستہ پڑھتے۔

آپ کی بات صرف مریدوں تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ خود بھی ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کو تمام عمر کسی شخص نے کبھی ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ رات کو حجرے کا دروازہ بند کیے بیٹھے رہتے۔ اور ذکر خدا میں مشغول رہتے۔ یہی سبب ہے کہ آپ سندھ سے لاہور تشریف لانے کے بعد بھی چالیس برس تک لاہور کے لوگوں میں گمنام رہے۔

عبادت و ریاضت اور مجاہدے سے انسان کی طبیعت ضبط نفس کو پا لیتی ہے۔ اور انسان میں جب یہ قدرت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی روحانیت کا یہ لازمہ ہے کہ وہ مخالف کی تمام قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے۔ پھر دنیا کی محبت اور کسی حاکم کی قوت نہ اسے اپنا غلام بنا سکتی ہے نہ اسے جیت سکتی ہے۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اکثر بڑے بڑے امراء وزراء اور بادشاہ جو آپ کے معتقد تھے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور بڑی بھاری بھاری رقمیں بطور نذرانہ پیش کرتے آپ فرماتے: تم مجھے دنیا کا فقیر سمجھ کر یہ نذرانے لائے ہو۔ جاؤ اسے لے جا کر مستحق لوگوں میں تقسیم کر دو۔ میں دنیا کا فقیر نہیں۔ اللہ کا ہوں۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ میں نے کسی اللہ والے کو دنیا کو اتنا حقیر سمجھنے والا نہیں دیکھا جیسا کہ آپ تھے۔

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ لاہور میں سندھ کے رہنے والے شیخ محمد نام ایک عالم باعمل اور نہایت فاضل و قابل بزرگ رہتے ہیں۔ توکل اور گوشہ عزلت ان کا شعار ہے تو مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن بوجہ چند میرے لیے لاہور پہنچنا دشوار ہو گیا۔ ناچار میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا۔ اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ

آپ میری درخواست پر دہلی تشریف لائے۔ اور ایک طویل عرصے تک مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع میسر آیا۔ اور بہت سے حقائق معارف ہاتھ آئے۔ میں نے ہر چند ان کی خدمت میں کچھ ہدیے اور نذرانے پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی شان فقر کو دیکھ کر اظہار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اس ملاقات پر جہانگیر نے آخر میں آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ میرے لیے کوئی خدمت ارشاد فرمائیں۔ کسی چیز کی خواہش کریں۔ آپ نے فرمایا۔ بس تم سے خواہش یہ ہے کہ اب مجھے رخصت کرو۔ چنانچہ جہانگیر نے آپ کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ اور آپ لاہور واپس تشریف لے آئے۔

اس کے بعد جہانگیر نے آپ سے باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھی۔ اکثر خود اپنے ہاتھ سے خط لکھتا اور آپ کے مقام و منصب اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتا۔ ایک خط میں آپ کو یوں لکھا پیر دستگیر میر ازیں نیاز مند درگاہ الٰہی جہانگیر۔ ایک مقام پر یوں تحریر کیا۔ محررہ جہانگیر شاہ بعرض حضرت شیخ میر برسد۔

جہانگیر کے بعد جب شاہجہان تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے بھی اپنے والد کی طرح بلکہ جہانگیر سے کچھ زیادہ ہی آپ کی قدر و منزلت کی۔ وہ دو مرتبہ آپ کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا اور دارا شکوہ دونوں مرتبہ اپنے باپ کے ہمراہ آیا۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ جب شاہجہان آپ کے حجرے میں داخل ہوا تو آپ نے سب سے پہلی بات جو شاہجہان سے کہی وہ یہ تھی کہ عادل و منصف بادشاہ کو اپنی رعیت و سلطنت کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے۔ اور تمام قوتوں کو مملکت کے آباد و خوش حال کرنے کے لیے صرف کرنا چاہیے۔ کیونکہ رعیت اگر خوش حال اور ملک آباد ہے تو فوج میں اطمینان اور خزانے میں دولت کے انبار لگے رہیں گے۔

دارا شکوہ لکھتا ہے کہ بیس برس کی عمر میں ایک مرتبہ مجھے ایک ایسا مرض لاحق ہوا کہ بچنے کی امید نہ رہی۔ جب تمام طبیب عاجز آگئے۔ کسی کی دوا کارگر نہ ہوئی تو شاہجہان مجھے آپ

کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے ۔ اور عرض کیا کہ میرا یہ بیٹا کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہے ۔ تمام حکیموں نے جواب دے دیا ہے ۔ آپ اللہ تعالٰے کی بارگاہ میں شفا کے لیے دعا فرمائیں آپ نے یہ سن کر دعا فرمائی ۔ اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مٹی کا وہ پیالہ جس میں خود پانی پیا کرتے تھے ۔ پانی سے بھر کر مجھے دیا ۔ جسے میں نے پی لیا ۔ قدرت خدا کہ چند ہی روز میں بیماری بالکل ہی جاتی رہی اور میں تندرست ہو گیا ۔

علامہ اقبال نے اسرار و رموز میں آپ کی شان فقر سے متعلق ایک واقعہ نظم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شہنشاہ ہند آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور عرض کیا کہ ایک عرصے سے میں دکن کی مہم میں مصروف ہوں ۔ لیکن مہم سر ہونے میں نہیں آتی ۔ آپ نے یہ سن کر خاموشی اختیار کی ۔ اتفاق سے اسی وقت ایک مرید آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور چاندی کے چند سکے آپ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا ۔ میں نے انہیں بڑی محنت و مشقت کے ساتھ جائز طور پر کمایا ہے ۔ آپ انہیں بطور نذرانہ قبول فرمالیں ۔ آپ نے فرمایا : یہ سکے شہنشاہ ہند کو دے دو ۔ جو باوجود بادشاہ ہونے کے اب بھی فقیر و گدا ہے ۔ اگرچہ اس کی حکومت چاند سورج اور ستاروں پر ہے لیکن پھر بھی حرص و ہوس میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو مفلس خیال کرتا ہے ۔ دنیا بھر کی دولت میسر آنے کے باوجود اس کی نیت نہیں بھری ۔ وہ دوسروں کے دستر خوان پر نظریں جمائے ہوئے ہے ۔ اور حرص و ہوس کی بھوک نے اسے تمام جہان کو ہڑپ کرنے پر آمادہ کیا ہوا ہے ۔ اس کی اس ناداری و ضرورت مندی سے خلق خدا سخت پریشان ہے ۔ اس کی سطوت اہل دنیا کی دشمن ہے ۔ اس کا کارواں نوع انسانی کا رہزن ہے ۔ اس کی فکر خام نے لوٹ مار وقتل و غارت گری کا نام تسخیر رکھا ہے ۔ خود اس کا لشکر اور اس کے غنیم کا لشکر اس کی بھوک کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہے ۔ شاید اسے معلوم نہیں کہ فقیر کی بھوک کی آگ تو اسی کی حد تک محدود رہتی ہے لیکن بادشاہ کی بھوک کی آگ ملک و ملت کو فنا کر دیتی ہے ۔ اور شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ جو شخص غیروں کے لیے تلوار اٹھاتا ہے وہ خود اپنے سینے میں خنجر

گھونٹتا ہے۔

جناب میاں میر کتاب و سنت پر عمل کرتے اور حدود شریعت سے قطعاً باہر نہیں جاتے تھے آپ کے اوصاف حمیدہ و اخلاق حسنہ کے بارے میں دارا شکوہ نے لکھا کہ اگر یہ چیزیں شکل انسان ہوتیں تو یہ جناب میاں میر ہوتے۔

آپ کا لباس ہمیشہ سادہ اور بہت معمولی قیمت کا ہوتا تھا۔ آپ سر پر پگڑی اور ایک موٹے کپڑے کا کرتہ پہنا کرتے تھے۔ مگر صفائی اور پاکیزگی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جب کبھی کپڑے میلے ہو جاتے انہیں دریا پر لے جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے دھوتے۔ مریدین اور معتقدین کو بھی یہی تاکید فرمایا کرتے کہ اپنا کام خود اپنے ہاتھ ہی سے کرنا چاہیے۔ اور لباس میں انہیں خاص طور پر ہدایت کرتے کہ لباس ایسا پہنو جیسا کہ ایک عام آدمی پہنتا ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ امیر ہے یا غریب۔ خرقہ جو صوفیوں کا خاص لباس ہے آپ نے اس کے پہننے کا مطلق رواج نہیں دیا۔

آپ نے تمام عمر کچھ ایسی گوشہ نشینی و گمنامی پسند فرمائی کہ باوجود اتنے بڑے عالم و فاضل اور صاحب فضل و کمال ہونے کے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ آپ کے مضامین کی ندرت کو دیکھ کر بڑے بڑے علماء و فضلاء عش عش کرا ٹھتے۔ اور نہایت عالمانہ انداز سے مسائل کو ایک ثانیہ کی مہلت میں یوں حل کر کے رکھ دیتے کہ بڑے بڑے علماء دنگ رہ جاتے لیکن اگر کوئی شخص آپ کے مضامین کو قلم بند کرنے کی کوشش کرتا۔ آپ اسے منع فرما دیتے تھے۔

آپ کے مریدوں کی تعداد بے شمار ہے۔ آپ قادری سلسلے کے بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے خلفاء سے فرمایا کہ دیکھو تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کہیں میری ہڈیاں نہ بیچنے لگنا۔ اور میری قبر پہ دوسروں کی طرح دکان نہ کھول لینا

آپ آخر عمر میں اسہال کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ پانچ دن تک بیمار پڑے رہے۔

۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ ہجری میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے ۔ آپ نے وفات اسی محلہ خان پور میں اپنے حجرے میں پائی ۔ جس میں آخر تک آپ بیٹھے رہے ۔ اور وہیں مدفون ہوئے آپ کا مزار اورنگ زیب عالم گیر نے تیار کروایا تھا ۔ مگر اس کے مسالے کا اہتمام پہلے سے دارا شکوہ نے کیا تھا ۔ مگر اسے موت سے مہلت نہیں ملی ۔ کہ حکومت کے جھگڑوں میں قتل ہو گیا ۔

سلسلہ قادری

ہندوستان میں قادری سلسلے کا آغاز سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں جناب سید محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ نے کیا جن کا سلسلہ نسب نو واسطوں سے جناب شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔

جناب سید محمد غوث ۱۴۸۲ء میں ملتان کے قریب روچھ نام ایک مقام پر آ کر مقیم ہوئے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور تصوف کے قادری سلسلے کو فروغ دیا اس زمانے میں وحدت الوجود کے خیالات مسلمانوں میں عام تھے جن کا آگے چل کر نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات کو یکجا کر کے بھگتی کے نام سے ایک مذہبی تحریک جاری ہوئی جس کے بانی بھگت کبیر کہے جاتے ہیں۔ جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوئے۔

جس زمانے میں جناب مجدد الف ثانی کی عالمگیر شخصیت قادری سلسلے کی راہ سے بالکل ہٹ کر قادریوں کے نظریہ وحدت الوجود کے خلاف اپنے مشہور نظریہ توحید شہودی کو پھیلا رہی تھی اور تصوف میں ان کا سلسلہ نقشبندی ہندوستان کے کونے کونے میں فروغ پا رہا تھا۔ جناب میاں میر صاحب جنہوں نے قادری سلسلے کی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے پائی۔ لاہور میں اکیلے۔ تن تنہا سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر قادری سلسلے کو ترقی دے رہے تھے۔

اگرچہ میاں میر صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے ہرچند یہ نظریہ مغل بادشاہوں کے مزاج کے موافق تھا۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور دارا شکوہ آپکے مرید تھے اور آپ کا بے حد احترام

کرتے تھے لیکن اس سے یہ رائے قائم کرنا کہ چونکہ میاں میر صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے اور یہ نظریہ مغلوں کے مزاج سلطنت کے لئے بہت مفید تھا اس لئے وہ آپ کے ارادتمند و عقیدت کیش تھے سراسر بے انصافی ہے درحقیقت یہ نتیجہ آپ کے صلح کل مشرب اختیار کرنے کا تھا جس نے آپ کو اس قدر جاذبیت و مقبولیت عطا کی کہ اپنے تو اپنے غیروں تک نے آپ کی غلامی کا طوق اپنے زیب گلو کیا جس کی ایک زندہ مثال امرتسر کا دربار صاحب ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جناب میاں میر علیہ الرحمۃ ہی نے سکھوں کی درخواست پر اپنے دست مبارک سے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔
جیسا کہ ایک مرتبہ جہانگیر نے آپ کو آگرے تشریف لانے کی دعوت دی آپ چلے تو گئے لیکن جہانگیر کے پاس پہنچ کر اس کے سامنے حسب معمول پند و نصائح کے دفتر کھولے اور جہانگیر نے جب مطمئن ہو کر آپ سے عرض کیا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا بس تمہارے لائق فقط ایک ہی خدمت ہے وہ یہ کہ ہم فقیروں کو آئندہ اپنے پاس بلانے کی زحمت نہ دو۔

شہزادہ دارا شکوہ اپنی کتاب سفینۃ الاولیا میں لکھتا ہے کہ جناب میاں میر صاحب طریقت کے لحاظ سے اپنے زمانے کے جنید تھے۔ کسی کو آسانی سے اپنی ارادت مندی کے حلقے میں داخل نہیں کرتے تھے۔ اور جب کسی کو اپنا مرید بنا لیتے اسے منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے آپ کی عادت یہ تھی کہ اپنے مریدوں کو مرید کہنے کی بجائے دوست کہتے۔ جب کسی کو بلانا ہوتا تو فرماتے جاؤ ہمارے فلاں دوست کو بلا لاؤ۔ اور وقت کے حاکموں اور بادشاہوں سے کسی صورت میں بھی نذر و نیاز یا ہدیے اور تحفے قبول نہیں کرتے تھے آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

شرط اول در طریق عاشقی دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

شاہ ابوالمعالی جناب میاں میر کے علاوہ قادری سلسلے کو فروغ دینے والی ایک شخصیت آپ ہی کے زمانے ایک اور بھی تھی۔ یہ جناب شیخ شاہ ابوالمعالی قادری تھے آپ کا اصل نام سید خیر الدین شاہ تھا ۹۶۰ء میں پیدا ہوئے سید موسیٰ گیلانی کے ایک مشہور پیر بھائی شیخ داؤد شیر گڑھی کے جانشین تھے آپ نے لاہور میں شاہ ابوالمعالی کے نام سے شہرت پائی آپ بھیرہ ضلع سرگودھا کے رہنے والے بتائے جاتے ہیں۔

دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ قادری سلسلے میں آپ کو شیخ داؤد کرمانی سے نسبت تھی۔ حدیقۃ الاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے حقیقی بھائی سید رحمت اللہ کے بیٹے ہیں۔ سید رحمت اللہ بن میر سید فتح اللہ کرمانی تین بھائی تھے۔ ایک شیخ داؤد کرمانی دوسرے سید جلال الدین کرمانی تیسرے یہی سید رحمت اللہ کرمانی جو شاہ ابوالمعالی قادری کے والد گرامی قدر ہیں۔

شاہ ابوالمعالی اپنے پیر و مرشد روشن ضمیر اور عم محترم جناب شیخ داؤد شیر گڑھی کی خدمت میں تین ۳ برس رہ کر لاہور تشریف لائے اور سلسلہ رشد و ہدایت کا آغاز کیا نیز کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے مرشد کے حکم کے مطابق جب شیر گڑھ سے لاہور کا سفر اختیار کیا تو راستے میں جہاں جہاں آپ ٹھہرے وہاں مسافروں کی سہولت کے لئے جا بجا کنوئیں، باغیچے اور پختہ تالاب بنواتے چلے گئے اسی پر قیاس کر لیجئے کہ جو لوگ منزل سلوک شاہ صاحب کی رہنمائی میں طے کرتے تھے شاہ صاحب انہیں منزل مقصود پر پہنچانے پر کتنا اچھا اور پیارا اہتمام نہ کرتے ہوں گے۔

شاہ صاحب ایک نغز گو شاعر بھی تھے غربتی اور معالی آپ کا تخلص تھا عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے جن میں اکثر صوفیانہ خیالات ہی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے جناب سید عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں رسالہ غوثیہ اور آپ کی کرامات

کے موضوع پر تحفۂ قادریہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا نیز حلیہ سرورِ دو عالم گلدستۂ باغِ ارم۔ مونس جاں اور زعفران زار ہم کتابیں بھی آپ کی یادگار ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کا ایک قلمی نسخہ "ہشت محفل" کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں بھی محفوظ ہے جسے آپ کے صاحبزادے جناب محمد باقر نے مرتب کیا تھا اس نسخے میں شاہ صاحب کے ملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔

شاہ صاحب کس پائے کے بزرگ تھے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی ایسے بزرگ آپ سے دلی ارادت رکھتے تھے اور باطنی تسکین کے لئے اکثر آپ کی توجہ۔ دستگیری و رہنمائی کے طالب رہتے تھے اور صرف یہی نہیں کہ جناب شیخ آپ کی سطوت روحانی ہی کے قائل تھے بلکہ اپنے تصنیف و تالیف کے مشغلے میں بھی اکثر آپ کی ہدایات اور مفید مشوروں کے محتاج رہے تھے۔ مثلاً جناب شیخ نے فتوح الغیب کی شرح آپ ہی کے اصرار پر تحریر کی۔ شرح مشکوٰۃ کی تالیف میں بھی آپ نے کافی ترغیب دی اور طرزِ نگارش کے بارے میں بھی اکثر مفید مشورے اور ہدایات دیں فرمایا کہ مشکوٰۃ کی شرح میں جابجا اشعار ہونے چاہئیں۔ جس سے اندازِ بیاں دلچسپ اور عبارت نہایت مؤثر ثابت ہو۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے بارے میں تمام سیرت نگار اور مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں حدیث کے علم کو ایک باقاعدہ اور منظم صورت میں سب سے پہلے آپ ہی نے عام کیا اور آپ نے علم حدیث کی صرف درس و تدریس ہی کے ذریعے اشاعت نہیں کی بلکہ اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور و مسلّم کتاب لمعات ہے۔

لمعات جو مشکوٰۃ کی شرح ہے جناب شیخ محدّث نے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کی۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

بر مدارج النبوتؐ کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی جذب القلوب فی دیار المحبوب کے عنوان سے مدینۃ النبیؐ کی تاریخ لکھی۔ جناب شیخ سید عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور آپ کے کلام بلاغت نظام بعنوان فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ علاوہ ازیں اخبار الاخیار کے نام سے بزرگان دین اولیائے کرام کے سوانح خاص کر جناب عبدالقادر جیلانی کی زندگی کے حالات بالتفصیل تحریر کئے۔ نیز داراشکوہ کی فرمائش پر جناب سید عبدالقادر جیلانی کی قدیمی اور مستند سوانح حیات کا زبدۃ الآثار کے نام سے خلاصہ پیش کیا۔

قیاس کیجئے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایسے بزرگ تسکین قلب اور فیوض باطنی کے لئے جس کی توجہ کے طالب اور اکثر دستگیری و رہنمائی کے محتاج رہتے تھے وہ شیخ کس پائے کا مرشد روحانی ہوگا۔ شیخ محدّث نے وہ ایک خط جو اپنے فرزند شیخ نورالحق کے نام لکھا تھا اس کے مندرجات سے جناب شیخ کے مرشد کامل شاہ ابوالمعالی قادری کے مرتبت کا ایک اندازہ ہوتا ہے۔ اس خط میں آپ نے اپنے سفر لاہور کی تفصیل تحریر کی ہے اور جناب شاہ ابوالمعالی کی توجہ التفات کے بارے میں روشنی ڈالی ہے کہ وہ ان کی تالیفات و تصنیفات کی تعریف کرکے ان کا دل بڑھاتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے جلال کے شان بھی دکھاتے ہیں ان کے آنے جانے پر سخت پابندیاں لگا دیتے ہیں۔ شیخ محدث ان کی زیارت کے لئے دہلی سے لاہور آنا چاہتے ہیں تو یہ سختی سے ان کو روک دیتے ہیں۔

سفینۃ الاولیا کے مترجم نے جناب شاہ ابوالمعالی کا سن ولادت ۹۲۰ ہجری لکھا ہے جو سہو کتابت ہے اور سال وفات ۱۰۲۴ھ تحریر کیا ہے جو صحیح ہے۔ ہم نے داراشکوہ کی "سفینۃ الاولیا" کا فارسی نسخہ دیکھا ہے جس میں تاریخ ولادت ۹۶۰ھ اور تاریخ وفات ۱۰۲۴ھ درج ہے۔ مفتی غلام سرور نے اپنی کتاب حدیقۃ الاولیا میں بھی سینن لکھتے ہیں مفتی صاحب نے جناب شاہ ابوالمعالی کی ولادت اور وفات کی منظوم

تاریخیں جیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں۔

بوالمعالی خیر دین احمدی | بود دانش معدنِ صدق و یقیں
سال تولیدو نامش چوں زوال | جُست سر در بندہ بس کمتریں
گفت نیکو خیر دین تولید او۔ | رحلتش گفتا معالی خیر دین

(ولادت) ۹۶۰ ہجری — (وفات) ۱۰۲۵ ہجری

جناب شیخ محدّث اور شاہ ابو المعالی قادری کے مختصراً سوانح ہم نے جملہ معترضہ کے طور پر پیش کئے ہیں گفتگو میاں میر صاحب کے باب میں ہے آخر میں ہمیں جناب شیخ کی سطوت روحانی سے متعلق مختصراً اسا یہ عرض کرنا ہے کہ جن دنوں شہنشاہ جہانگیر کشمیر میں تھا۔ حاسدوں اور شرپسندوں نے شیخ محدث اور مرزا حسام الدین کے خلاف اس کے کان بھرے۔ جہانگیر نے فوراً ان دونوں کو حاضر ہونے کا حکم بھیجا چنانچہ جب شیخ محدث جہانگیر کے حکم کی تعمیل دہلی سے چلے تو سب سے پہلے جناب میاں میر کی خدمت میں لاہور پہنچے اور پریشانی کا اظہار کیا۔ حضرت میاں میر نے فرمایا۔ تمہیں یوں ہی پریشان ہو گئی اطمینان رکھو کچھ نہیں ہوگا۔ نہ تمہیں کشمیر جانا پڑے گا نہ تمہارے بیٹے کو کابل شیخ حسام الدین بھی دہلی ہی میں رہیں گے اور تم لوگ بھی وہیں خوش و خرم رہو قدرت خدا اس واقعہ کو ابھی دو چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔

شاہ ابو المعالی نے پینسٹھ ۶۵ برس کی عمر پائی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی چورانوے سال دو مہینے حیات رہے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب دہلی میں مدفون ہوئے۔ میاں میر صاحب نے اٹھاسی برس کی عمر میں اس دنیا سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔

مجدد الف ثانیؒ

ولادت (۹۷۱ ہجری سرہند میں پیدا ہوئے) کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ مقام ایک جنگل تھا جس میں شیر رہا کرتے تھے۔ جب یہاں شہر آباد کیا گیا تو اسی مناسبت سے اس کا نام "شیر ہند" تجویز ہوا۔ جو آگے چل کر "شیر ہند" سے بگڑتے بگڑتے سرہند بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی سرہند میں جناب عمر فاروقؓ کی ایک اولاد کو لاکر یہاں آباد کر دیا۔ جن کے بزرگ محترم جناب شیخ عبدالاحد فاروقی سلسلہ چشتیہ کے ایک عالم باعمل بزرگ۔ یہی بزرگ جناب شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے والد گرامی قدر تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے پائی۔ ان کے علاوہ آپ نے دیگر علمائے اسلام کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مبداء فیاض نے آپ کو کچھ ایسا ذہن رسا عطا فرمایا تھا کہ جملہ اسلامی علوم یہ تمام و کمال سترہ برس کی عمر تک حاصل کرلئے بلکہ ان میں کمال بتجر پیدا کر لیا۔ اولاً آپ نے قرآن حکیم حفظ کیا پھر فقہ، حدیث و تفسیر و دیگر اسلامی علوم حاصل کئے غرض نہایت ہی قلیل مدت میں آپ ایک متبحر عالم دین ہو گئے۔

علوم ظاہری و باطنی میں تکمیل پانے کے بعد آپ کے والد محترم مولانا شیخ عبدالاحد فاروقی نے آپ کو خرقہ خلافت عطا فرمایا اور اس امانت کے سونپنے کے بعد مولانا عالم جاودانی کو رحلت فرما گئے۔

والد کے انتقال کے بعد آپ حج کے ارادے سے دہلی تشریف لے گئے۔ دہاں ایک

اس کے بعد آپ دہلی میں خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے

بزرگ کے ہاں قیام کیا۔ انہوں نے ایک عارف کامل جناب خواجہ باقی باللہ نقشبندی کا آپ سے ذکر کیا۔ آپ کو ان کے فضائل سن کر ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ ان کے ہمراہ جناب خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مختصراً یہ کہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت مسرور ہوئے۔ اور دونوں ان بزرگ سے آپس میں ایک دوسرے کی ملاقات کرانے کے شکر گزار تھے۔ خواجہ باللہ کا طرز عمل آپ سے نہایت مخلصانہ و مشفقانہ رہا۔ انہیں دیکھ یوں محسوس ہوتا کہ یہ جناب شیخ احمد کے مرید ہیں۔ حالانکہ جناب شیخ احمد سرہندی جناب خواجہ باقی باللہ کے مرید تھے۔

خواجہ باقی باللہ آپ کا بڑا احترام کرتے اور آپ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آپ سے فرمایا۔ ہم نے یہاں سرہند میں ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا۔ اس کی روشنی یک لخت بڑھنے لگی۔ پھر ہمارے جلائے ہوئے چراغ سے بیسیوں چراغ روشن ہو گئے اور وہ چراغ تم ہو۔

دسویں صدی ہجری یا اکبر کے زمانے میں اسلام ایک ایسے دور سے دو چار تھا جس میں کفر و زندقہ و الحاد نقطہ عروج پر تھا۔ ایک طرف علمائے اسلام کے آپس میں جھگڑے، ایک دوسرے پر حملے۔ شدید باہمی رقابتیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی زمام اقتدار اکبر جیسے بے علم و بے دین بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ جسے ملک پر حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ ایک نئے مذہب کا بانی بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی خواہش تھی۔

اکبر نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی چال چلی جسے آج ہمارے زمانے کی زبان میں ڈپلومیسی کہتے ہیں۔ وہ ہر مذہب و ملت کے شخص کی دل جوئی کرتا اور اس کے مذہب کو برحق سمجھتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ نہایت چالاکی سے اسے یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ اب زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات و خیالات اور تقاضوں کے پیش نظر یہ مذہب ختم ہو گیا اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

اکبر چاہتا تھا کہ ہندوستان کے تمام مذاہب کو مٹا کر ایک نیا مذہب قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے لوگ اپنا اپنا دین و مذہب ترک کر کے شامل ہوں اور اس کی سلطنت کے استحکام کا باعث بنیں۔ چنانچہ ملا مبارک جو اپنے زمانے کا ایک متجر عالم تھا۔ دین کو چھوڑ کر دنیا کی طلب میں اکبر کے فاسد خیالات کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اکبر لیسے بے علم بادشاہ نے ملا مبارک جیسے عالم و فاضل اللسان کی تائید و حمایت پا کر "دین الہیٰ" کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دی اور اس میں داخل ہونے والوں کے لیے ایک عہد نامہ ترتیب دیا۔ جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میں فلاں ابن فلاں اپنی ذاتی خواہش و رغبت اور دلی ذوق و شوق سے دین اسلام مجازی و تقلیدی کو ترک کر کے اکبر کے "دین الہیٰ" میں داخل ہوتا ہوں۔ اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبے قبول کرتا ہوں۔ یعنی ترک مال، ترک جان، ترک عزت و ناموس اور ترک دین کا اقرار کرتا ہوں۔"

اکبر کے دین الہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سورج کی پرستش چار وقت لازمی قرار دی گئی۔ آگ، پانی، درخت اور گائے وغیرہ کا پوجنا جائز ہو گیا۔ ماتھے پر قشقہ لگانا۔ گلے میں زنار پہننا۔ مذہب حقہ کی علامت بن گیا۔ ان کے علاوہ داڑھی منڈوانا، غسل جنابت نہ کرنا، ختنہ کی رسم کو بیکار و باعث آزار سمجھ کر ترک کرنا۔ دین الہی کے ماننے والوں کی شناخت قرار پائی۔

غرض تمام شعائر اسلامی کو یہ کہہ کر ترک کر دیا کہ دین اسلام ایک ہزار برس گزر جانے کے بعد بالکل اسی طرح بیکار و بے مصرف ہو گیا۔ جس طرح اسلام سے پہلے کے مذاہب اپنے ہزار سال گزارنے کے بعد عضو معطل کی طرح ختم ہو گئے۔

اصل میں اکبر شروع شروع میں ایک مسلمان آدمی تھا۔ لیکن بعد میں جوں جوں ہندوؤں سے اس کا میل جول بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں رشتے ناطے ہونے لگے توں توں ان کے اختلاط کے اثر سے وہ ہندو مذہب کے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ وہ اسلامی

روایات جو اس کے بزرگوں نے قائم کی تھیں۔ ہندوؤں سے گہرے اختلاط کے سبب ایک ایک کر کے مٹنے لگیں۔

ایسے حالات میں ضرورت تھی کہ ایک عارف کامل اور مرد مجاہد کی جو اسلام کی مدافعت میں سینہ سپر ہو کر باطل کی قوتوں کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اپنے سینہ میں وہ عزم و جوش اور ولولہ پیدا کر کے میدان عمل میں آگے بڑھے کہ اس کی ہیبت وصولت سے قدم قدم پر کامرانی اس کی قدم بوسی کرے۔

اکبر کے عہد حکومت میں ہندو بڑی بڑی کلیدی آسامیوں پر فائز تھے۔ ہر جگہ ان کا اقتدار قائم تھا۔ وہ بے خوف و خطر مسلمانوں کی دلآزاری کرتے۔ مسجدیں شہید کر کے وہاں مندر بناتے کعبہ کی طرف بیٹھ کر حوائج ضروریہ سے فراغت پاتے۔

ہندوؤں کے برت کا دن آتا ہے۔ تو اکبر کی طرف سے تمام سخت حکم نافذ کیے جاتے۔ کہ آج کے دن کوئی مسلمان روٹی نہ پکائے۔ اور نہ کچھ کھائے پیئے۔ اس کے برعکس جب رمضان کا مہینہ آتا۔ ہندو اعلانیہ کھاتے پیتے۔ اور کھلے ہندوں رمضان کے مہینے کی بے حرمتی کرتے۔ شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرا کرتے تھے۔

ان دنوں اکبر کا دارالحکومت بجائے دہلی کے آگرہ ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں آگرہ کا نام اکبر آباد تھا۔ جناب شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہند سے آگرے کو روانہ ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر آپ نے بڑی دلیری و بے باکی سے اکبر کے درباریوں سے فرمایا:۔

اے لوگو! تمہارا بادشاہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے پھر گیا اور اللہ کے دین سے باغی ہو گیا ہے۔ جاؤ اسے میری طرف سے جا کر کہہ دو کہ دنیا کی یہ دولت و حشمت اور تخت و تاج سب فانی ہیں۔ وہ توبہ کر کے خدا اور اس کے رسول کے دین میں داخل ہو جائے اور ان کی اطاعت کرے۔ ورنہ اللہ کے غضب کا انتظار کرے۔

درباریوں نے آپ کا پیغام لیا اور اکبر کو پہنچا دیا۔ لیکن اکبر نے سنی ان سنی کر دی۔ اور

مطلق پرواہ نہ کی۔ بلکہ الٹا آپ کو مباحثہ کا چیلنج کر دیا جسے آپ نے فوراً قبول کر لیا۔

دنیا کو دین پر ترجیح دینے والے علماء اکبر کی طرف تھے۔ دنیا کو دین پر قربان کرنے والے چند بوریہ نشین اصحاب آپ کے ساتھ۔ مباحثہ کا انتظام ہو چکا تھا۔ مگر کارکنانِ قضا وقدر کو منظور نہیں تھا۔ کہ اکبر ایسے بے علم و بے دین بادشاہ کے دربار میں جناب محمد رسول اللہ کے دین پر مر مٹنے والوں کی رسوائی ہو۔ ابھی مباحثہ کا آغاز ہونے بھی نہ پایا تھا کہ ہوا کا ایک سخت طوفان آیا اور تمام دربار اکبری تہ و بالا ہو گیا۔

خیموں کی چوبیں اتنے زور سے اکھڑیں کہ ہزار کوششوں کے باوجود پھر انہیں سنبھالا نہ جا سکا۔

قدرت خدا کہ اکبر اور اس کے تمام ساتھی تو زخمی ہو گئے۔ لیکن جناب شیخ اور ان کے درویشوں میں سے کسی کو ایک خراش تک نہ پہنچی۔ مورخین کہتے ہیں کہ انہی زخموں کی وجہ سے جو مباحثہ کے دن خیموں کی چوبوں سے اکبر کو آئے اکبر کی موت واقع ہوئی۔ نیز لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے عقائد سے تائب ہوا اور بستر مرگ پر نئے سرے سے اسلام قبول کر کے دنیا سے گیا۔

اکبر کے مرنے کے بعد اب آپ کا دوسرا محاذ ان دنیا پرستوں کے خلاف قائم ہوا۔ جن کی خوشامد، چاپلوسی اور بے جا تعریف سے اکبر عقلِ سلیم سے محروم ہو کر دین الٰہی کے قائم کرنے کا مدعی ہوا۔ ان لوگوں میں علماء فضلا بھی شامل تھے۔ اور وہ لوگ بھی شریک تھے جن کے اغراض محض سیاسی تھے۔

اب ہندوستان کے تخت پر تو شہنشاہ نورالدین جہانگیر تھا۔ اور حکم اس کی ملکہ نورجہاں کا چلتا تھا۔ "جہانگیر خود کہا کرتا تھا"۔ "ہم نے ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے عوض سلطنت نورجہاں کو دے دی"۔

اللہ کے جن بندوں کو آداب محمدی آتے ہیں وہ آداب شاہی کی کبھی پرواہ نہیں کرتے۔ ایک طرف ہندوستان کا طاقتور بادشاہ اکبر، دوسری طرف اکبر کی حکومت سے ٹکر لینے والا

اللہ کا وہ نیک بندہ جو بظاہر ایک بوریہ نشین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا یہ معرکہ لوگوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت حاصل کر گیا۔ حکومت کے بڑے بڑے اراکین سے معمولی سے معمولی آدمی تک سب کے دلوں میں آپ کی حق گوئی دبے باکی نے آپ کی شخصی عظمت، علمی فضیلت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی روحانی قوت کا رعب وجلال بٹھا دیا۔ ایک خلق خدا آپ کے حلقہ ارادت مندی میں داخل ہوگئی۔

دنیا پرست لوگوں کا وہ گروہ جس نے دین کے عالموں کا لبادہ پہن کر بادشاہ کی مصاحبت ورفاقت اختیار کی۔ آپ کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اپنے لیے سخت مہلک محسوس کیا۔ چنانچہ وہ آپ سے حسد کرنے اور آپ کے اثر ونفوذ کو کم کرنے کے لیے آپ کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کے مکتوبات کی تحریف کرکے انہیں لوگوں میں پھیلانا شروع کیا۔

ان بد باطن لوگوں کی کاروائیوں نے یہاں تک اثر کیا کہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ایسے بزرگ ان کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے آپ کے خلاف کتابیں لکھیں۔ اور آپ کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ جس کا انہیں بعد میں عمر بھر قلق رہا۔

حاسدوں نے آپ کے خلاف جہانگیر کے کان بھرنے کے لیے نورجہاں کو آلہ کار بنایا۔ نورجہاں چونکہ اپنے بھائی آصف جاہ کو ولی عہد سلطنت بنائے جانے کے خواب دیکھ رہی تھی اور یہ لوگ اس کی تائید میں تھے۔ اس لیے اس آرزو کی تکمیل کے لیے اس سے جہاں تک بن پڑا۔ اس نے جہانگیر کو آپ کے خلاف خوب اکسایا۔

آخر چند غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب کر لیا۔ آپ تشریف لے گئے۔ وہاں چند سوال وجواب ہوئے۔ آپ کے طرز کلام میں چونکہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہوئی جو قابل مواخذہ ہوتی لہٰذا سلامتی کے ساتھ واپس آگئے۔

بد باطن لوگوں نے دیکھا کہ ان کا پہلا وار ناکام گیا اب انہوں نے دوسرا حربہ یہ اختیار

کہ جہانگیر کی نظر سے وہ کتابیں گزاریں جو غلط فہمیوں میں پڑ کر شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے آپ کے خلاف لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کر کے جہانگیر سے کہا کہ یہ شخص آپ کی حکومت کے لیے سخت خطرناک ہے۔ سجدۂ دربار جو اکبر بادشاہ کے زمانے سے رائج چلا آرہا ہے یہ اس کے خلاف اپنا فتویٰ دے چکا ہے۔ اس کے پاس اس وقت کم و بیش دو ہزار سوار ہیں۔ جو کسی وقت بھی آپ کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔

حاسدوں نے سوچا کہ ہماری یہ چال دوہرا کام کرے گی۔ کہ اگر آپ نے بادشاہ کو سجدہ نہ کیا تو بادشاہ کے عتاب میں آجائیں گے اور اگر کر دیا تو اپنے مریدین سے جائیں گے۔ ان کے دلوں میں آپ کی فضیلت و عظمت مطلق باقی نہ رہے گی۔

جہانگیر کو مذہب کے معاملے میں حکومت زیادہ پیاری تھی۔ وہ یہ باتیں سن کر تلملا اٹھا۔ اس نے فوراً آپ کو دربار میں حاضر کیے جانے کا حکم دیا۔ آپ دربار میں تشریف لے گئے لیکن سجدہ شاہی جس کا وہ طالب تھا قطعاً ادا نہ کیا۔ اس پر جہانگیر غضب ناک ہوا۔

آپ نے جہانگیر سے بڑی دلیری کے ساتھ پوچھا۔ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ اپنے لیے سجدہ تعظیم۔ اللہ کا بندہ کبھی غیر کا بندہ نہیں ہو سکتا۔ جو حاکموں کے حاکم کی بارگاہ میں سر جھکائے وہ کبھی کسی جھوٹے اور مٹ جانے والے حاکم کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔ بھلا میں اپنے ہی جیسے ایک مجبور و بے بس انسان کو سجدہ کروں۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سجدہ خدا کے سوا کسی کو جائز نہیں۔

جہانگیر آپ کے یہ کلمات حق سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس کے سان گمان میں کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی شخص اتنی دلیری، بے باکی اور جرأت کے ساتھ گفتگو کرے گا۔ اس نے فوراً آپ کے قتل کیے جانے کا حکم دے دیا۔ اللہ اکبر حکم قتل پاکر آپ کے چہرے پر مطلق کسی پریشانی اور خوف و ہراس کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ نہایت استقلال اور حوصلے کے ساتھ کھڑے رہے۔ مگر اس مقلوب القلوب

کی حکمت دیکھیے کہ تھوڑی ہی دیر میں جہانگیر نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ اور بجائے قتل کے قید کیے جانے کا حکم دیا۔

چنانچہ آپ قید کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ جہانگیر کے حکم سے آپ کا گھر بھی لوٹا گیا۔ یہ وقت اصل میں وہ تھا کہ جس کی پیش گوئی آپ قید ہونے سے بہت پہلے اپنے درویشوں مریدوں اور معتقدوں سے کر چکے تھے۔

آپ کے قید کیے جانے کی اطلاع پا کر سب سے پہلے شاہجہان نے آپ سے رجوع کیا۔ اس نے اپنے خاص الخاص دو معتمد افضل خان اور خواجہ عبد الرحمٰن کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اور فقہ کی وہ کتابیں جن میں سجدہ تعظیمی کی اباحت بیان کی گئی تھی، ہمراہ بھیجیں۔ اور کہلا بھیجا کہ اگر آپ بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ تعظیمی کر لیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو مطلق کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

آپ نے شاہجہان کے پیغام میں اسے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ ہر چند جان بچانے کے لیے یہ بھی جائز ہے۔ لیکن عزیمت اسی میں ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔

جہانگیر نے حکومت کے بڑے بڑے ارکین کو آپ کے قید کیے جانے سے پہلے ہی مختلف علاقوں کے گورنر بنا کر ادھر ادھر بھیج دیا تھا۔ مصلحت اس کے نزدیک یہ تھی کہ آپ کے اوپر گرفت کرنے میں اسے آسانی رہے۔ لیکن جب ان گورنروں کو آپ کی گرفتاری کا علم ہوا تو سب نے آپس میں ایکا کر کے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی جیسے کہ مہابت خان۔ مرتضیٰ خان۔ تربیت خان۔ سید صدر جہاں۔ اسلام خاں۔ خان جہاں لودھی۔ حیات خان۔ دریا خان۔ غرض آپ کے تمام معتقدین جہانگیر کے مقابلے کو نکل آئے۔

مہابت خان نے بادشاہان بدخشاں و خراسان اور توران سے امداد لے کر جہانگیر پر لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ جہانگیر بھی اپنی فوج و سپاہ لے کر مقابلے کو نکلا۔ ابھی دونوں لشکر

مقابلہ پر آنے ہی تھے کہ جہانگیر کے لشکر سے بہت سے آدمی مہابت خان سے جا ملے۔ آخر جہانگیر اور آصف جاہ دونوں کو مہابت خان نے گرفتار کر لیا۔ اور خطبے و سکے سے اس کا نام باہر نکال دیا۔

اس کے بعد مہابت خان نے آپ کی خدمت میں واقعات کی تفصیل عرض کی۔ اور درخواست کی کہ ہماری خواہش ہے کہ مغل سلطنت کے تخت شاہی پر اب آپ جلوہ افروز ہوں۔ آپ نے اس کے جواب میں مہابت خان کو لکھا۔ مجھے سلطنت پانے اور حکومت کرنے کی ہرگز ہوس نہیں۔ اور میں تمہارے اس فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے جو قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی ہیں وہ کسی اور مقصد کے لیے ہیں۔ وہ مقصد جب پورا ہو جائے گا تو میں آپ سے آپ قید سے رہائی پالوں گا۔ یہ فساد میرے مقصد میں حائل ہے۔ بہتر ہے کہ تم بغاوت سے باز آجاؤ۔ اور فوراً اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کرلو۔ میں بھی انشاءاللہ تعالےٰ جلد ہی قید سے رہائی پالوں گا۔

ابھی اثنا میں نورجہاں کو بھی گرفتار کیا جا چکا تھا۔ کہ جہانگیر و آصف جاہ کی گرفتاری کی اطلاع پر انہیں چھڑانے آئی تھی۔ قریب تھا کہ مہابت خان کے غیض و غضب سے یہ تینوں اپنے کیے کی سزا پالیتے کہ آپ کا خط آگیا۔

مرشد کے حکم کی تعمیل کی۔ مہابت خاں جہانگیر کے پاس آیا اور کہا میں آپ کو اپنے مرشد کے حکم سے رہا کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد جہانگیر کو تختِ شاہی پر بٹھا کر تمام آداب شاہی بجا لایا۔

تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ آپ کامل ایک برس تک زنداں میں پڑے رہے جہانگیر نے جب دیکھا کہ ان کے مریدوں نے جوشِ محبت میں آکر بغاوت کی اور قریب تھا کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل کر دیا جاتا۔ ایسے حالات میں بھی آپ نے سلطنت سے کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ انہوں نے اپنے مریدوں کو بغاوت سے روک دیا تو اس کے دل سے بدکردار لوگوں کے پیدا کیے ہوئے آپ کے خلاف شکوک و شبہات جاتے رہے اور اس نے آپ

کو نہایت ادب واحترام کے ساتھ رہا کر دیا۔

جو اللہ کے ہو جاتے ہیں اللہ ان کا ہو جاتا ہے بھلا ان کی نگاہوں میں دنیا کی کیا قدر وقیمت رہتی ہے۔ جہانگیر نے واقعات کی روشنی میں ایک طرف آپ کی بے نفسی دیکھی تو دوسری طرف نور جہاں اور اس کے بھائی آصف جاہ کی سازشوں کو دیکھ لیا۔

جناب شیخ سرہندی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ آصف جاہ اور نور جہاں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس کے بعد جہانگیر کو آپ سے اتنی عقیدت پیدا ہوئی کہ کشمیر سے آتے جاتے دو مرتبہ آپ کے لنگر یا باورچی خانے سے کھانا کھانے کی سعادت حاصل کرتا۔ اگرچہ کھانا سادہ ہوتا۔ لیکن وہ تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔ کہتا۔ میں نے ایسا لذیذ آج تک نہیں کھایا۔

تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جہانگیر آخیر عمر میں اکثر یہ بات کہا کرتا کہ میں نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے نجات کی امید ہو۔ البتہ میرے پاس ایک دستاویز یہ ہے۔ کہ مجھ سے ایک روز جناب شیخ احمد سرہندی نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالےٰ ہمیں جنت لے جانے کا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے۔

غرض یہ تھے وہ احوال مسلمانوں اور برائے نام مسلمان حکومت کے جن میں اللہ تعالےٰ نے آپ کو مسلمانوں کے ایمان کی تجدید کرنے کا موقع دیا اور آپ کو الف ثانی کا مجدد بنایا۔

جیسا کہ یہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے۔ آپ نقشبندی سلسلے کے بزرگ خواجہ باقی باللہ کے مرید ہوئے۔ اس لیے آپ سے تصوف کا جو سلسلہ آگے چلا اسے مجددیہ نقشبندیہ کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جناب خواجہ بہاؤالدین نقشبندیہ سے شروع ہوتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے کہ وہ کپڑے پر نقش ونگار اور گل بوٹے نکالنے کا کام کرتے تھے۔

حق تو یہ ہے کہ نقشبندی سلسلہ بھی حضرت علی ہی پر جا کر منتہی ہوتا ہے۔ جو لوگ اسے

حضرت صدیق اکبر سے جا ملاتے ہیں وہ صرف اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جناب امام جعفر صادق کو اپنے نانا جناب ابوبکر صدیق سے بھی انتساب حاصل ہے .

شجرہ نقشبندیہ

(۱) جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) جناب ابوبکر صدیق

(۳) جناب سلمان فارسی

(۴) امام محمد بن قاسم ابن ابوبکر صدیق

(۵) امام جعفر صادق

(۶) حضرت بایزید بسطامی

(۷) حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی

(۸) ابوالقاسم گرگانی

(۹) خواجہ ابو علی فارمدی

(۱۰) خواجہ یوسف ہمدانی .

(۱۱) خواجہ عبدالخالق عجدوانی

(۱۲) خواجہ عارف ریوگری

(۱۳) خواجہ محمود ابوالخیر فغنوی .

(۱۴) خواجہ عزیز العلی رامتینی

(۱۵) خواجہ محمد بابا سماسی .

(۱۶) خواجہ سید امیر کلال

(۱۷) خواجہ بہاء الدین نقشبند بانی سلسلہ نقشبندیہ

۱۸۔ خواجہ علاؤ الدین

۱۹۔ خواجہ یعقوب چرخی

۲۰۔ خواجہ عبیداللہ احرار

۲۱۔ خواجہ محمد زاہد

۲۲۔ خواجہ درویش محمد

۲۳۔ خواجہ محمد امکنگی

۲۴ خواجہ محمد باقی عرف باللہ

۲۵۔ امام ربانی جناب شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

جناب سلمان فارسیؓ کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پہ بیعت کرنا قطعا غیر معتبر ہے وہ حضرت علیؓ کے مرید و شاگرد تھے اور ایک طرح سے انہیں اہل بیت میں شمار کیا گیا تھا۔ اس لئے نقشبندی سلسلہ کا یہ شجرہ طریقت کا جناب ابوبکر صدیقؓ کی ذات پر منتہی ہونا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

تصانیف :۔

۱۔ مکتوبات

۲۔ مبداء و معاد

۳۔ معارف لدنیہ

۴۔ مکاشفات غیبیہ

۵۔ شرح رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ

۶۔ رسالہ تہلیلیہ

۷۔ رسالہ فی اثبات النبوت

(۸) رسالہ سلسلہ احادیث

اولاد:۔ آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔

وفات:۔ آپ کو اکثر جوڑوں کے درد کی شکایت رہی۔ شاید یہ مرض ایامِ قید میں لاحق ہوا ہوگا۔ آخیر عمر میں اس بیماری نے بہت غلبہ پالیا۔ وفات سے تین دن پہلے آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ دعا کیجیے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔ جمعہ کے دن مسجد میں گئے۔ وعظ کیا اور ادائے نماز سے فراغت پائی تو لوگوں سے یہ کہہ کر کہ مجھے امید نہیں کل اس وقت تک دنیا میں رہوں۔ آپ خلوت میں تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپ کی اطلاع کے مطابق دوسرے دن دوپہر میں ترسیٹھ سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ تاریخ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۷۹ ہجری ہے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی رائے

جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب "قول جمیل" میں نقشبندی طریقت کا شجرہ اس طرح بیان کیا ہے ۔ شیخ احمد سرہندی نے خواجہ باقی باللہ سے فیض باطنی حاصل کیا ۔ جناب خواجہ نے خواجہ محمد امکنگی سے ۔ جناب امکنگی نے مولانا محمد درویش اور مولانا محمد زاہد سے ۔ جناب زاہد ، درویش نے خواجہ عبید اللہ احرار سے احرار نے مولانا یعقوب چرخی اور خواجہ علاؤ الدین غجدوانی سے غجدوانی چرخی نے خواجہ علاؤ الدین عطار اور خواجہ محمد پارسا سے ۔ پارسا و عطار نے خواجہ بہاؤ الدین بانی سلسلہ نقشبندیہ سے ۔ خواجہ نقشبند نے بہت سے بزرگوں کی صحبت پائی جن میں سب سے زیادہ مشہور خواجہ محمد سماسی اور ان کے خلیفہ امیر سید کلال ہیں ۔

خواجہ سماسی نے خواجہ علی رامتینی سے انہوں نے خواجہ محمود ابو الخیر فغنوی سے فغنوی نے عارف کر یوی سے ۔ کر یوی نے خواجہ عبد الخالق غجدوانی سے ۔ غجدوانی نے خواجہ یوسف ہمدانی سے ۔ ہمدانی نے جناب علی نارمدی سے نارمدی کے بہت سے مشائخ تھے ۔ جن میں سے امام ابو القاسم قیشری اور خواجہ ابو القاسم گرمانی خاص کر مشہور رہیں ۔ گرمانی و قیشری نے جناب ابو بکر شبلی سے ۔ شبلی نے سید الطائفہ جناب جنید بغدادی سے ۔ بغدادی نے اپنے ماموں شیخ سری سقطی سے ۔ سقطی نے معروف کرخی سے ۔ کرخی نے بہت مشائخ کے علاوہ امام علی بن موسیٰ رضا سے موسیٰ رضا نے اپنے والد امام موسیٰ کاظم سے ۔ جناب کاظم نے اپنے والد امام جعفر صادق سے ۔ جناب صادق نے اپنے والد امام باقر سے جناب باقر نے اپنے والد امام زین العابدین

سے۔ امام جناب زین العابدین نے اپنے والد جناب امام حسین علیہ السلام سے اور انہوں نے جناب علی بن ابی طالب سے۔ علی ابن ابی طالب نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیوضات باطنی حاصل کئے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ جناب معروف کرخی کے دوسرے مشہور شیخ۔ شیخ داؤد طائی ہیں جو فضیل۔ حبیب عجمی اور ذوالنون مصری کے فیضیافتہ تھے۔ اور ان تینوں بزرگوں نے تابعین اور تبع تابعین سے بہت سے شیوخ کی صحبت کے علاوہ سب سے بڑھ کر جناب خواجہ حسن بصری کی صحبت وبرکت سے فیض حاصل کیا۔ جناب خواجہ کو جناب علی ابن ابی طالب کے شاگرد و مرید ہونے کی سعادت میسر آئی۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں امام جعفر صادق کو اپنے نانا جناب "قاسم بن ابوبکر صدیق سے بھی انتساب حاصل ہے۔ جناب قاسم نے سلمان فارسی سے فیض پایا۔ جناب فارسی نے ابوبکر صدیق سے اور ابوبکر صدیق نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خواجہ باقی باللہ

مقامات سلوک طے کرنے اور فیوض باطنی سے بہرہ یاب ہونے کے باب میں جناب مجدد الف ثانیؒ کے پیر و مرشد جناب باقی باللہ کا اسم گرامی سیرت مجددیہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب مجدد کے مرشد خواجہ باقی باللہ کے سوانح کسی قدر اختصار کے ساتھ تبرکاً پیش کئے جائیں

خواجہ ۱۲ جولائی ۱۵۶۲ء کابل میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام رضی الدین تھا۔ لیکن شہرت دوام باقی باللہ کے نام سے پائی۔ آپ کے والد محترم جناب قاضی عبدالسلام بڑے جید عالم تھے۔

جناب خواجہ نے ابتدائی تعلیم غالباً اپنے والد گرامی قدر ہی سے حاصل کی اس کے بعد علوم عقلی اور نقلی دیگر اساتذہ سے حاصل کئے۔ آپ کے اساتذہ میں جناب ملا حلوائی جو عام طور پر ایک شاعر نغز گو کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے اور نہایت متبحر عالم تھے۔ سر فہرست ہیں۔

ملا حلوائی نے اکبر کے چھوٹے بیٹے مرزا حکیم والئی کابل کی پُر زور فرمائش پر درس و تدریس کا آغاز کیا تھا۔ جن دنوں آپ بوجوہ چند کابل چھوڑ کر ماوراء النہر چلے گئے جناب خواجہ بھی اپنے محترم استاد کے ساتھ تھے۔

ماوراء النہر پہنچ کر اور افغانستان میں جتنے صوفیائے کرام و بزرگان دین تھے خواجہ ان سب کی خدمت میں یکے بعد دیگرے حاضر ہوئے۔ لیکن دل کا سکون اور طمانیت قلب جس کی مدتوں سے خواجہ کو تلاش تھی یہاں کہیں بھی نہ ملا۔

پھر اسی تجسس میں آپ ہندوستان تشریف لائے اور یہاں بہت سے بزرگان دین سے استفادہ کیا۔ اجمال اس بیان کا یہ ہے کہ کشمیر میں بابا ولی کشمیری سے لاہور میں شیخ فرید بخاری سے ملنے کا موقعہ ملا اور ان کے علمی فضائل اور باطنی کمالات سے مستفید ہوئے پھر جب کچھ مدت لاہور میں قیام کرنے کے بعد آپ یہاں سے چلے تو دہلی پہنچے اور وہاں پہنچ کر چشتیوں کے سلسلے کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں اقامت اختیار کی اور ان کے بیٹے شیخ قطب العالم کی خدمت میں رہ کر مقامات سلوک طے کئے

ایک مدت گزرنے کے بعد جب شیخ قطب العالم نے انہیں بخارا کا سفر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی تو آپ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں بخارا کو چل پڑے اور وہاں پہنچ کر مشائخ و اولیائے کرام کی صحبت سے فیضیاب ہوئے بالخصوص نقشبندی سلسلے کے ایک نہایت مقتدر بزرگ خواجہ محمد درویش کے فرزند ارجمند جناب خواجہ مکنگی کی خدمت میں رہ کر دین و دنیا کی سعادت پائی۔

خواجہ مکنگی نے آپ کو سلسلۂ نقشبندیہ کی تعلیم دی اور اس کے بعد حکم دیا کہ ہندوستان کو واپس جائیں اور وہاں بندگانِ خدا کے درمیان رہ کر انہیں حق کی طرف بلائیں اور اسلام کی تعلیم دیں کہ یہ تمہارا فرض منصبی ہے۔ چنانچہ خواجہ مرشد کی تعلیم میں عازم ہندوستان ہوئے آپ سمرقند سے ہوتے پہلے پشاور پہنچے اور پھر لاہور آئے یہاں تم وبیش آپ ایک سال تک رہے اس کے بعد آپ دہلی چلے گئے۔ اور وہاں فیروز شاہ تغلق کے قلعے میں قیام کیا خدا کی مخلوق سے محبت کرنا اولیاء اللہ کا امتیازی نشان ہے اور یہی وہ طاقت ہے کہ جس سے اولیائے کرام دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اسلام کی توحید کا منشاء بھی یہی ہے۔ اور اس کا مظاہرہ اسلام کی تعلیمات کے ہر شعبے میں ہے یہاں تک کہ اسے آپ نماز باجماعت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ نماز باجماعت میں جہاں ایک طرف تنظیم عسکریت نظر آتی ہے وہاں دوسری طرف یکسانیت و محبت بھی کارفرما ہے۔

کہتے ہیں خواجہ کے قیام لاہور کے دوران ایک مرتبہ یہاں سخت قحط پڑا لوگ فاقوں مرنے لگے خواجہ اپنے مقدور بھر جو مدادا کر سکتے تھے وہ انہوں نے کیا اور اس طرح فاقہ زدگان کے غم میں شریک ہوئے، اپنی خوراک بہ نسبت پہلے کے اور بھی مختصر کر دی اکثر روزے رکھتے اور شام کو گھر میں جو کھانا پکتا اس کا بیشتر حصہ غریبوں کو بھجوا دیتے تھے۔

جناب خواجہ دہلی میں کل تین چار برس زندہ رہے مگر اس قلیل مدت میں آپ نے سلسلہ نقشبندیہ کی بہ تمام و کمال ہندوستان میں بنیاد رکھی اور اسے اتنا مضبوط کیا

کہ پھر اس کی بنیادیں کسی کے ہلائے کبھی ہل نہ سکیں اور یہ کیا کم ہے کہ جناب خواجہ کا مجدّد الف ثانیؒ ایسا صاحب قلم اور عالم باعمل مرید ہے کہ جس نے اکبر ایسے بادشاہ سے ٹکرّ لی یہاں تک کہ اس کا دین الٰہی جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آپ نے تاریخ اولیاء میں دیکھا ہو گا کہ اکثر اولیائے کرام امراء و رؤساء سے دور رہے اور ان کے قرب کو اختیار نہیں کیا۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کے ہاں یہ روایت اس کے بالکل برعکس ہے آپ کے یہاں اگر ایک طرف علما میں شیخ عبدالحق محدّث دہلوی۔ شیخ تاج الدین سنبھل۔ خواجہ نور محمد اور مجدّد الف ثانی ایسے مرید ین ہیں۔ تو دوسری طرف امراء میں خان اعظم مرزا عبدالرحیم خانخاناں سپہ سالار دکن جو اکبر کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ بخشی الملک شیخ فرید قلیچ خاں حاکم پنجاب جو اکبر کے بیٹے دانیال کا خسر بھی تھا۔ مرزا حسام الدین جو شیخ مبارک کا داماد یعنی اکبر کے دین الٰہی کے دو بڑے سرگرم کارکن ابوالفضل اور فیضی کا بہنوئی تھا۔ اور نواب مرتضیٰ خاں ایسے مقتدر امیر جس نے جہانگیر کی جانشینی کے تمام امور طے کئے اور جہانگیر سے شریعت اسلامی پر چلنے کا حلف لیا غرض بڑے بڑے اراکین حکومت آپ کے معتقدین تھے اور آپ کی اطاعت کے حلقے کو اپنے لئے دین و دنیا کی سعادت جانتے تھے۔

امراء و رؤساء سے میل جول بڑھانے اور تعلقات قائم کرنے سے آپ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ آپ ان سے اپنے کام نکالیں اور اپنی خواہشات کو پورا کریں۔
بلکہ یہ تعلق جناب خواجہ عبیداللہ احرار کہ جن سے خواجہ باقی باللہ کو بالخصوص دلی تعلق تھا۔ ان کے اس قول کی تعمیل میں تھا کہ معززین سے میل ملاپ رکھو تاکہ ان کے تعلق سے تم بندگان خدا کی شکایات کو دور کر سکو۔ معلوم ہوا کہ امراء سے تعلق رکھنا یا نہ رکھنا اولیائے کرام کے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ان پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر کے ان سے دوسروں کے کام نکلوانا ہے بصورت دیگر اگر اس تعلق سے ذاتی اغراض وابستہ ہوتیں تو جناب خواجہ

ایک لاکھ کی وہ رقم کبھی واپس نہ کرتے جو آپ کے خانخاناں مرزا عبدالرحیم نے حج کے سفر کے لئے پیش کی تھی اور بکمال و ادب و مودت یہ عرض کیا تھا کہ آپ اس رقم کو قبول کر کے فریضہ حج ادا کر لیجئے مگر آپ نے یہ کہہ کر کہ اس قسم کے حج سے کچھ فائدہ نہیں جو مانگے تانگے کی رقم سے ادا کیا جائے آپ نے وہ ایک لاکھ روپیہ واپس کر دیا۔

درحقیقت اراکین حکومت سے تعلقات بڑھانے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اکبر کے ملحدانہ خیالات امرا کی تائید پا کر پھیل نہ جائیں اس لئے اس کا سدِ باب کرنے کے لئے یہ لازم ہوا کہ اراکین حکومت سے اختلاط بڑھا کر ان کے ذہن کو دین اسلام کے باب میں راسخ کیا جائے افسوس کہ جب دونوں خواجہ دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے ان دنوں اکبر کے زمانے کے تمام مقتدر و ممتاز مؤرخ مثلاً میر نظام الدین مصنف طبقات اکبری اور ملا بدایونی ایسے جلیل القدر حضرات وفات پا چکے تھے۔ اس لئے آپ کے حالات بالتفصیل نہیں ملتے تاہم بر سبیل تذکرہ اکثر کتابوں میں آپ کی سیرت کے بہت سے واقعات مل جاتے ہیں۔

تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ مرزا حسام الدین دکن کی مہم پر مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے ساتھ تھے جناب خواجہ سے انہیں محبت نہیں عشق تھا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ جذبہ ان کی طبیعت پر کچھ ایسا غالب آیا کہ امارت کو لات مار کر فقیر بن گئے اور پھر تمام عمر خواجہ ہی کی خدمت کے ہو رہے حتیٰ کہ جب خواجہ نے سفر آخرت اختیار کیا تو اس وقت ان کے سوا کوئی اور خواجہ کے پاس نہیں تھا۔ جناب خواجہ نے بعمر چالیس سال ۳۰ نومبر ۱۶۰۳ء میں انتقال کیا۔ واضح رہے کہ جناب خواجہ باقی باللہ اور آپ کے مرید یگانہ روزگار جناب مجدد الف ثانی دونوں قریب قریب ہم عمر ہی تھے۔

خواجہ کے انتقال کے بعد آپ کے دونوں بیٹے خواجہ عبیداللہ المعروف بہ خواجہ کلاں اور خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ خرد تربیت کے لئے جناب مجدد کے دامن میں

چلے گئے کہ خواجہ نے اپنی زندگی ہی میں انہیں جناب مجدد سے بسم اللہ کروائی تھی اور پرورش کے لئے مرزا حسام الدین کے دامن شفقت میں آ گئے۔ واضح رہے کہ خواجہ خورد بوہی بزرگ ہیں جن سے گیارھویں صدی ہجری کے مشہور عالم اور فلسفی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد محترم شاہ عبدالرحیم نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مرزا حسام الدین نے ۱۰۴۳ھ؍ ۱۶۳۳ء میں انتقال کیا ان کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ جب تک حیات رہیں اپنے شوہر نامدار کی وصیت یا اشارے کے مطابق بارہ ہزار روپے سالانہ جناب خواجہ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے بھیجتی رہیں۔

آپ نے خواجہ کے اثر و نفوذ اور ان کے اقتدار کا اندازہ لگا لیا ہو گا۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے آپ کا سیرت کا سب سے زیادہ جاذب نظر پہلو آپ کی طبیعت کی مسکینی و فروتنی تھا۔ جانے کتنی ہی مخلوق خدا آپ کے پاس مرید ہونے کو آتی مگر آپ ان سے یہ کہکر معذرت کر لیتے کہ بھائی مجھ میں اتنی صلاحیت کہاں؟ جو تمہارا ہاتھ پکڑ سکوں کسی مرد کامل کی طرف دامن بڑھاؤ اور اگر ایسا کوئی بزرگ مل جائے تو مجھے بھی مطلع کرنا مگر جب کوئی شخص گھر سے یہ تہیہ ہی کر کے نکلے اور مرید ہونے پر بے حد اصرار کرے تو آپ مجبور ہو جاتے پھر آپ اسے مرید کر لیتے۔

ہر چند مریدین پر کامل توجہ دیتے اور ان کے تزکیہ نفس کی پوری کوشش کرتے لیکن اپنی طبیعت کے انکسار اور عجز کو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ دیتے اکثر کہا کرتے اے اللہ تو مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور اسی حال میں موت دے اور کل قیامت کے دن جب تو اٹھائیگا تو مسکینوں ہی کے گروہ سے مجھے اٹھانا۔

جناب مجدد الف ثانیؒ سے جب آپ ملتے تو آپ کے عجز و انکسار سے یوں معلوم ہوتا کہ آپ مرید ہیں اور مجدد الف ثانی آپ کے مرشد ہیں اور اکثر مجدد صاحب کے بارے میں کچھ اس انداز سے اظہار خیال کرتے کہ شبہ واقعی خفیفت نظر آنے لگتا۔ چنانچہ آپ

کی نسبت ایک دوست کو لکھتے ہیں "سرہند میں شیخ احمد نام ایک بڑے علم والا اور قوی عمل والا ہے۔ چند روز فقیر کی مجلس میں رہا۔ فقیر نے اس کے روزگار اوقات سے بہت عجیب عجیب باتیں دیکھیں۔ امید ہے کہ وہ ایک ایسا چراغ ہوگا جس سے تمام جہان منور ہو جائیگا۔ اس کے احوال کامل دیکھ کر مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا ہی ہوگا اللہ کا شکر ہے کہ شیخ مذکور کے جتنے عزیز و اقارب اور بھائی ہیں سب کے سب نیک اور عالم آدمی ہیں اس دعا گو نے بعض سے ملاقات کی ہے تمام بیش قیمت جواہر ہیں۔ اور بڑی عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ اس شیخ کے فرزندان ارجمند جو اپنے جگر بند و دلبند ہیں اللہ تعالٰی کے اسرار ہیں۔

غرض تمام شجرہ طیبہ کی طرح ہیں جس سے پاک شاخیں ہی نکلی ہیں۔ لیکن کثرت عیال اور فقر و تنگدستی کے سبب اور کوئی وجہ معاش نہ ہونے سے ان تمام کے اوقات مشکل سے کٹ رہے ہیں اگر ہر سال زکوٰۃ کے طور پر ان لوگوں کے لئے کچھ مقرر ہو جائے اور تقسیم کرنیوالا ان کے درمیان مناسب طور پر تقسیم کر دیا کرے تو بہت ہی اچھا ہے اور بہت ہی نیکی اور اجر کا باعث ہے تھوڑا بہت جتنا بھی مقرر ہو جائے خیرات اور نیکیوں کا۔ رکن عظیم ہوگا۔ فقرا اللہ تعالٰی کے دروازے ہوتے ہیں اور بہت ہی عجیب دل رکھتے ہیں۔

جناب خواجہ کے اس خط سے جہاں ان کی بے نفسی و بے غرضی اور بندگان خدا کے لئے درد اور تڑپ دکھائی دیتی ہے وہاں ان کی وہ جوہر شناسی و قدر دانی بھی معلوم ہوتی ہے جو حضرت مجدد صاحب کے بارے میں ان کے قلم معجز رقم سے ادا ہوئی ہے ہر چند زبان عجز سے آپ جو کچھ جناب مجدد کی شان میں فرماتے ہیں وہ لفظ بلفظ عین حقیقت لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ آپ منفی طرز کا ذہن رکھتے تھے یا علمی فضائل اور باطنی کمالات میں کسی سے کم تھے۔ حق تو یہ ہے کہ تصوف کی تاریخ میں آپ کا مقام بہت اونچا ہے اور آپ ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ بھلا وہ بزرگ جس کے فیضان صحبت سے مجدد الف ثانی" ایسا یگانہ روزگار تربیت پائے۔ کیا

مقام و منصب میں کسی سے کم ہو سکتا ہے اور ہندوستان میں نہایت قلیل مدت میں نقشبندی سلسلے کی مضبوط و مستحکم بنیادیں رکھنا اس پر طرفہ ہے اور یہ آپ کی روحانی عظمت اور موجب خیر و برکت شخصیت ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

ابتدا میں جناب مجدد نظریہ وحدت الوجود کے قائل تھے ۔ چنانچہ جب اسی عقیدے کی روشنی میں آپ نے ایک رباعی لکھ کر جناب خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں پیش کی وہ رباعی یہ تھی ۔

اے دریغا کیں شریعت ملت آمائی است
ملت ما کافری و ملت ترسائی است
کفر و ایماں ہر دو زلف و روئے آں زیبائی است
کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

جناب خواجہ نے اپنے بلند اقبال اور طالع مند مرید مجدد الف ثانی کو فوراً ایک خط میں سختی سے تنبیہ کی اور انہیں لکھا کہ وہ ملحدانہ رباعی جو آپ نے لکھی تھی ۔ آپ نے اس میں بہت ہی ناسمجھی اور کم عقلی کی ہے ۔ ایسی لغو رباعی لکھنے والا کبھی مقبول نہیں ہو سکتا اس لئے ادب کو نگاہ میں رکھنا چاہیے ۔ اللہ تعالیٰ بڑا غنی اور غیرت مند ہے ۔

مرید باسعادت نے مرشد کامل کے فرمان کو چشم بصیرت سے دیکھا اور گوش ہوش سے سنا اور مراد کو پہنچ گئے ۔ چنانچہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ ابتداً مجھے سلوک کی تین منزلوں سے گزرنا پڑا ۔ اولاً وجودیت ۔ ثانیاً ظلیت ثالثاً عبدیت یعنی پہلے مرحلے میں جناب مجدد وحدت الوجود کے قائل تھے ۔ اور خدا اور کائنات میں عینیت کا اعتراف کرتے تھے ۔ دوسرے مرحلے پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ کائنات کا وجود تو ہے لیکن وہ حقیقت مطلقہ کا ظل

ہے یہاں دوئی کا تصور پیدا ہُوا اور ان کی نگاہ میں وحدت الوجود کے مسئلے کی صداقت کھٹکنے لگی۔ پھر جب آپ عبدیت کے مقام پر پہنچے تو خدا و کائنات میں دوئی بدرجہ اتم ثابت ہوگئی اور انہوں مسئلہ وحدت الوجود کو باطل ثابت کر دیا۔

ع عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

وحدت الوجود خدا کے سوا عالم میں کوئی اور شئے ہے ہی نہیں یا جو کچھ ہے وہ ہے ہم سب ہم سب کچھ نہیں اس عقیدے یا نظریے کا نام وحدت الوجود یا ہمہ اوست ہے۔ اس عقیدے کی رو سے صوفیوں کے نزدیک یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے سلسلۂ کائنات سے ایک الگ اور جدا گانہ ذات ہونے کا خیال صحیح نہیں جیسا کہ اہل ظاہر کی رائے ہے اگرچہ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالےٰ سلسلہ کائنات سے الگ نہیں تمام صوفیائے کرام کے نزدیک تسلیم شدہ امر ہے لیکن اس عقیدے کی تعبیر میں ان کے یہاں بھی اختلاف ہے مولانا روم کہتے ہیں۔ ؎

چو ہست مطلق آمد در عبارت
بہ لفظ "من" کنند ازوے اشارت

وجود مطلق جب تشخصات و تعینات میں جلوہ افروز ہوتا ہے تو ممکنات کے اقسام پیدا ہوتے۔ یہ اقسام کس طرح پیدا ہوتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے حباب اور موج ہر چند یہ قسمیں مختلف ذاتیں شمار کی جاتی تھیں لیکن حقیقت میں ان کا وجود پانی کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ مولانا کہتے ہیں۔ ؎

گفتم از وحدت و کثرت سخنے گوئی بہ رمز
گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

یا ایک مثال سے یوں سمجھے کہ جس طرح دھاگے میں جو گرہیں لگائی جاتی ہیں ان کا وجود اگرچہ دھاگے سے ایک الگ اور علیحدہ شئے نظر آتا ہے لیکن واقعتہً گرہ دھاگے سے کوئی مختلف چیز نہیں۔

وحدت الوجود کے مسئلہ پر غالب علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفے خود را در گماں انداختہ

اے خالق تو نے عالم کے غیر و ماسوا ہونے کا وہم دلوں میں ڈال دیا ہے لیکن تو نے درحقیقت خود ہی ایک حرف "کن" کہکر اپنے آپ کو اس گمان کا شکار بنا لیا ہے کہ مخلوق اپنے خالق سے کوئی علیحدہ شے ہے۔

دیدہ بیروں و درون از خویشتن پر دا گہی
پردہ رسم پرستش در میاں انداختہ

جو نور آنکھ کے اندر ہے وہی آنکھ کے باہر ہے گویا تیری آنکھیں اپنے ہی نور سے اپنا ظہور دیکھ رہی ہیں۔ یعنی شاہد و مشہود، ناظر و منظور اور عابد و معبود ایک ہی ذات ہے اے خالق تو نے دوئی کا دھوکہ دے کر پرستش کی رسم کا پردہ اپنی ہی دو حیثیتوں کے درمیان ڈال دیا ہے۔

با چنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی
مردہ را از خویش دریا بر کراں انداختہ

مگر اے خالق کثرت کی ہنگامہ آرائی کے باوجود تیری یکتائی میں دوئی کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں۔ دریائے وحدت نے دوئی کو اس طرح نکال باہر کیا ہے جس طرح کوئی مردہ (لاش) موجوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے ساحل دریا سے آ لگے

وجودی صوفیوں اور فلسفیوں نے وحدت و کثرت کے موضوع کو نہایت آسان اور سادہ الفاظ میں سمجھانے کے لئے بیشتر مثالیں دی ہیں۔ مثلاً

مولانا رومؒ کہتے ہیں۔ لوہا جب آگ میں گرم کیا جاتا ہے تو وہ گرمیٔ آتش پکڑ کر ہمرنگ آگ بن جاتا ہے اگرچہ وہ آگ نہیں بن جاتا۔ تاہم اس میں آگ کی تمام خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ آگ ہو گیا وجودی صوفیہ کہتے ہیں کہ حدیث نبوی میں ہے

کہ خلق الادم علیٰ صورتہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے چنانچہ اسی مناسبت سے انسان میں جو مختلف صفات پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب صفات ربانی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مظہر خداوندی ہیں۔

صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام ہیں۔ مثلاً رحمٰن۔ رحیم۔ ستار غفار۔ قہار۔ جبار۔ رزاق۔ یعنی مسمیٰ واحد اور اسماء بہت سے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر اسم سے ایک ہی ذات مراد لی جاتی ہے گویا اس اعتبار سے واحد مسمّٰی کے متعدد اسماء اس کے عین ہیں اور یہ تمام اسماء اس کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ صفات سے ممکنات کا ظہور ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی اسم کی مظہر ہے اس لئے ثابت یہ ہوا ہے کہ موجودات کی ہر چیز عین ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام موجودات کا ظل اور ان کی اصل ہے۔ کائنات اس کا ظل اور ظل حقیقت میں اصل کا مظہر ہوتا ہے جیسے انسان کا جب زمین پر سایہ پڑتا ہے تو بظاہر وہ ایک الگ شے معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں جو کچھ ہے انسان ہی ہے۔ اسی طرح کائنات کا وجود غیر حقیقی اور صرف خیال ہے وجود صرف خدا کا ہے۔ کائنات وکثرت صرف وحدت کے اعیان ومظاہر کی حیثیت سے دکھائی دیتی ہے۔ بذاتہ اس کا اپنا کوئی وجود نہیں اس لئے وجود جو ہے وہ وحدت ہی کا ہے اصغر کہتے ہیں۔ ؎

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا

درد کہتے ہیں ؎

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

غالب کہتے ہیں ؎

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ایضاً ۔

اصل شہود و شاہد مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دردؔ کہتے ہیں ے

جمع ہیں افراد عالم ایک ہیں
گل کے سب اوراق پر ہم ایک ہیں

میرؔ کہتے ہیں ے

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

وحدت الوجود کے اس عقیدے کی بدولت بعض اذہان اس خیال کی طرف جاتے ہیں کہ فرعون جو خدا ہونے کا مدعی ہوا، اس نے کیا غلط کیا اور انا الحق کی جو آواز منصور کے منہ سے نکلی اس میں کیا برائی تھی۔ جب وحدت الوجود کے نظریے کی رو سے ہر شے خدا ہے تو ناحق ان لوگوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔

درحقیقت یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ اگر اس کی تعبیر میں ذرا سی بھی لغزش ہو جائے تو اس کی حدیں کفر و الحاد اور زندیقیت سے جا ملتی ہیں۔ ہم وحدت الوجود کے موضوع کو قدرے تفصیل سے بیان کریں گے اور جہاں جہاں مجدد الف ثانی نے وجودیوں سے اختلاف کیا ہے انہیں بالاجمال پیش کریں گے۔

عقیدہ وحدت الوجود عقیدہ وحدت الوجود کو سب سے پہلے ذوالنون مصری نے (متوفی ۲۴۵ھ) تیسری صدی ہجری میں پیش کیا۔

ظاہر ہے کہ موصوف مصر کے رہنے والے تھے اس لئے ان کا اشراقیت جدیدہ سے متاثر ہونا قطعی ممکن ہے۔ یہ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ جناب ذوالنون مصری نے اپنی رضا و طمع سے تصوّف اسلام کو وحدت الوجود ایسا پیچیدہ عقیدہ بخشا اور اس کے نظریات میں وجد و معرفت کے خیالات شامل کئے اور نو فلاطونی رجحانات کو صوفیائے اسلام کے ذہن میں واضح کیا۔

جناب مصریؒ کے علاوہ ان کے ہم عصر بزرگ جناب بایزید بسطامیؒ نے بھی اس سلسلے میں بڑا کام کیا انہوں نے صوفیہ کو خود فراموشی اور فنا کے مسائل تعلیم کئے۔ اور وحدت الوجود کے نظریات کو شطحیات کے انداز میں پیش کیا اور پھر ان کے مرید جناب ابوسعید ابوالخیر نے اپنی رباعیات میں اپنے مرشد کے موضوع سخن کو بڑی ترقی دی واضح رہے کہ یہ ابوالخیر وہی بزرگ ہیں جن کا اسم گرامی بھی جناب مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ صاحب کشف المحجوب کے اساتذہ کی فہرست میں شامل ہے

مختصراً یہ کہ تیسری صدی ہجری علم تصوّف کی تصنیفات و تالیفات کا ابتدائی زمانہ ہے اس دور میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں جناب جنید بغدادیؒ المتوفی ۲۹۷ھ کی کتاب "رسالہ القصد الی اللہ" عربی زبان میں تصوّف کی قدیم ترین کتاب خیال کی جاتی ہے جناب جنید بغدادیؒ نے تصوّف کے مسائل میں ایک ترتیب اور ضابطہ پیدا کیا فقہ اور تصوّف کے موضوع سے صوفیائے کرام اور علمائے عظام کے درمیان جو آویزش پیدا ہو گئی تھی اسے یہ کہہ کر مٹانے کی سعی بلیغ فرمائی کہ شریعت اور طریقت دو علیحدہ اور الگ الگ راہیں یا مسلک نہیں بلکہ ایک ہی تعلیم کے دو رخ ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ دونوں ایک ہی ہیں۔

بعضوں کا خیال ہے کہ تصوف کے موضوع پر جس نے سب سے پہلے قلم اٹھایا وہ جناب یحییٰ بن معاذ رازی ہیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ رازی کی کتاب المریدین پیش

کرتے ہیں۔ جناب معاذ رازی نے ۲۰۶ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے علاوہ شیخ ابوالنصر سراج (متوفی ۳۷۸ھ) نے کتاب اللمع لکھی۔ نیز عبدالکریم بن ہوازن قشیری نے تحریر کیا جس میں فنا۔ بقا۔ بسط۔ حال اور جمع و تفرقہ وغیرہ صوفیانہ اصطلاحات قائم کیں۔

علاوہ ازیں تیسری صدی ہجری ہی میں تصوف کے مختلف سلسلے قائم ہوئے جو بڑھتے بڑھتے پھر سینکڑوں کی تعداد تک پہنچ گئے۔ تصوّف کے ابتدائی سلسلوں میں سے چند ایک یہ تھے مثلاً

۱۔ محاسبیہ۔ اس کے بانی جناب جنید بغدادی کے محترم بزرگ جناب عبداللہ حارث محاسبی متوفی ۲۴۳ھ ہیں۔ انہوں نے حال و مقام کے اصطلاحی فرق مقرر کئے اور بہت سی اصطلاحات قائم کیں۔

۲۔ قیصریہ۔ اس سلسلے کو جناب شیخ قیصری نے قائم کیا۔ اس سلسلے کی بنیاد ملامت پر ہے یعنی اس کے پیرو بظاہر ایسے کام کرتے جس سے ان کی لوگوں میں رسوائی ہو اور انہیں ملامت کی جائے۔ ان لوگوں کو اسی اعتبار سے ملامتیہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہ تمام اہتمام اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی اطاعت اور زہد و عبادت ریاکاری نہ بن جائے۔

۳۔ طیفوریہ۔ اس سلسلے کی ابتدا جناب ابویزید طیفوری بسطامی سے ہوئی انہوں نے اپنے معتقدین کو صحو و سکر کی تعلیم دی۔ صحو و سکر کا مختصر بیان "کشف المحجوب" کے مضامین کے باب میں کسی مقام پر پیش کریں گے۔

۴۔ جنیدیہ تصوّف کا یہ سلسلہ جناب جنید بغدادی نے قائم کیا۔ جس کی بنیاد صحو و محبت پر تھی اور مراقبہ و مجاہدہ خاص شغل قرار پایا۔

چوتھی صدی ہجری میں حسین بن منصور حلاج نے مقتدر باللہ عباسی کے عہد خلافت میں وحدت الوجود کے نظریات کو ایک نئے انداز میں پیش کرنا شروع کیا اب تک تعلیم و تلقین اشارے اور کنائے میں ہوتی یا گوشۂ خلوت میں کہا جاتا لیکن منصور نے بر سرعام لب کشائی کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وحدت الوجود کے فتنے سے بچنے کے لئے منصور کو ۳۰۹ھ

میں سولی پر لٹکانا پڑا۔

منصور سے متعلق علمائے کرام میں غم و غصہ اور اختلاف تو تھا ہی اہل تصوف بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک گروہ کے نزدیک اسے واجب التعظیم ٹھہرایا گیا ہے اور دوسرے گروہ نے اسے ملحد و زندیق خیال کیا ہے۔

فرید الدین عطار نے منصور کو قتیل اللہ فی سبیل اللہ شیر بیشہ تحقیق ایسے القاب سے یاد کیا ہے۔ ابوبکر شبلی کہتے تھے کہ میں اور منصور نے عقل سے جان گنوالی اور میں نے جنون سے اپنی جان بچالی۔ جناب فرید الدین عطار اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ بعض مشہور صوفیائے کرام منصور کی بزرگی تسلیم نہیں کرتے۔

جناب مخدوم علی ہجویری اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ جناب منصور کی حلاج کی تعظیم و تکریم کرتا ہوں لیکن کسی کو ان کے مسلک کی پیروی کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ کیونکہ اس کی بنیاد نہیں۔ چنانچہ ہجویریؒ کے اس قول کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ خیال لفظاً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے مسلہ پر جن خیالات کا اظہار منصور نے کیا ہے قدیم صوفیہ کو ان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

پانچویں صدی ہجری میں امام غزالیؒ نے اس مابعد الطبعی نظام کو مٹانے یا اس کی اصلاح کرنے کی سعی بلیغ فرمائی جو ایرانی و ہندوستانی مذاہب کے اثر سے تصوف میں شامل ہو چکا تھا نیز امام غزالیؒ نے مسائل تصوف اور احکام شریعت میں باہم مطابقت کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جس سے پایۂ تصوف علمائے اسلام کی نگاہ میں بلند نظر آنے لگا علاوہ ازیں امام غزالیؒ نے سفر، سالک، تجلی، فصل، علت، مکان، رسم ہمت اور ذہاب وغیرہ ہم صوفیانہ اصطلاحات وضع کیں۔ احیاء العلوم کیمیائے سعادت اور مشکوٰۃ الانوار وغیرہ غزالیؒ کی مشہور تصنیفات ہیں۔

امام غزالیؒ کے بعد خواجہ فرید الدین عطار نے تصوف کے موضوع پر خامہ فرسائی کی اور مثنوی منطق الطیر اور تذکرۃ الاولیا ایسی دو بلند پایہ کتابیں لکھیں پھر ان کے بعد جناب مولانا جلال الدین روم

کا نام آتا ہے جن کی مثنوی کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے ؎

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

آخر میں جناب خواجہ عبید اللہ احرار کے شاگرد و مرید مولانا عبدالرحمٰن جامی آتے ہیں۔ نفحات الانس لوائح جامی آپ کی تصوف کے موضوع پر دو مشہور کتابیں ہیں۔ مختصراً یہ کہ تصوف اپنے علمی ادوار کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کے نظریات کی برابر اشاعت کرتا رہا حتیٰ کہ محی الدین عربی ایسے عرب نژاد فلسفی کا زور قلم اسے میسر آگیا۔

جناب محی الدین ابن عربی جو اپنے علمی تبحر کی بدولت شیخ اکبر کہلاتے ہیں سب سے پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے وحدت الوجود کے نظریے کو خالص فلسفیانہ انداز میں پیش کیا اور اس سلسلے میں فصوص الحکم ان کی معرکتہ الآرا تصنیف خیال کی جاتی ہے اور اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ شیخ اکبر باوجود عربی نژاد کے ہونے کے ایرانی صوفیا آج تک ان کی تحریم و تکریم بجا لاتے ہیں اور کتاب کا نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ چھٹی صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۰۵ ہجری نے وحدت الوجود کے مسئلے کو فلسفیانہ انداز اور استدلالی رنگ میں پیش کیا فصوص الحکم کے علاوہ فتوحات مکیہ بھی تصوف کے موضوع پر ان کی مشہور تصنیف ہے۔

وحدت الوجود کے نظریے کو قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے کے لئے جو آیات قرآنی پیش کی جاتی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ ھو الاول ھو الاخر ھو الظاھر ھو الباطن — ترجمہ: وہی اوّل ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔

۲۔ اللہ نور السمٰوات والارض — اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے

۳۔ ھو معکم اینما کنتم — وہ تمہارے ساتھ ہے تم جدھر بھی رخ کرو۔

۴۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ — تم جس طرف بھی منہ کرو اس طرف اللہ کا منہ ہے۔

ابتدائی دور کے جن بزرگوں کو یہ لوگ صوفیائے قدیم ٹھہراتے ہیں ان کے یہاں دیکھئے تو ان باتوں کا مطلقاً کوئی گزر نہیں۔ مثلاً خواجہ حسن بصری ابراہیم ادہم۔ فضیل عیاض امام سفیان ثوری رحمہم اللہ تعالےٰ اجمعین کے یہاں خیالات نے رمز و کنائے یا تشبیہ و استعارہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ ان بزرگوں کی زبان، نثر نے نظم کی یعنی شاعری کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔

لیکن جب سے تصوف کی زبان شعر و شاعری کے حلقے میں آئی تب سے اس موضوع پر نئے نئے خیالات اور افکار پیش ہونے لگے۔ حتیٰ کہ تصوف کے تمام مسائل پر وحدت الوجود کا مسئلہ بازی لے گیا۔ بلکہ مسائل تصوف میں وحدت الوجود کا نظریہ جان تصوف ٹھہرا جو سراسر عجمی ذہن کی پیداوار ہے۔

دراصل اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں اپنی کہنہ۔ کائنات کی تخلیق۔ مخلوقات کی حقیقت اور خالق و مخلوق کے درمیان جو رشتہ ہے ان مسائل سے متعلق کوئی مکتبۂ فکر قائم نہیں کیا جب اسلام کا دائرہ وسیع ہونے لگا اور غیر مسلموں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا تو ان کے اذہان اسلام کی تعلیمات سے پورے طور پر مستفید نہ ہونے کے سبب ان مسائل کی طرف پھر گئے جن کی بنیاد پر وحدت الوجود کا عقیدہ قائم ہوا۔

قرآن حکیم میں چونکہ اللہ تعالےٰ کے اوّل و آخر۔ حاضر و ناظر۔ ظاہر و باطن۔ قادر و غالب۔ جبّار و قہار۔ اور رب نور السموات و الارض ہونے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس لئے جب مذکورہ بالا مسائل پیدا ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے بآسانی

"وحدت الوجود" کے نظریے کی صورت میں حل تلاش کر لیا۔

قرآن حکیم میں سے ایسی آیات موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا قسم کے مسائل کا استنباط کر کے عقل کے مطالبات پورے کئے جا سکتے ہیں لہٰذا وحدت الوجود کا مسئلہ خالص فلسفیانہ شان میں وجود پذیر ہوا جس کی آگے چل کر محی الدین ابن عربی نے فلسفیانہ انداز میں نوک پلک سنوار دی۔

محی الدین ابن عربی کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ وجود صرف وحدت کا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خدا کے سوا کسی دوسری شئے کا وجود ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے خدا ہے ہم سب کچھ نہیں۔ اگرچہ کائنات اور اس کی بے شمار اشیا ہر وقت انسان کے مشاہدے اور استعمال میں آتی رہتی ہیں۔ وہ بدیہی طور پر موجود نظر آتی ہیں تاہم وجود کو وحدت محض میں منحصر کر دینے کے بعد ان تمام اشیا کے وجود سے انکار کرنا لازم ہے ہر چند کائنات وجود تو رکھتی ہے لیکن اس کا وجود حقیقی نہیں بلکہ وہ اللہ تعالےٰ کے وجود کا ظل یا پرتو ہے اگرچہ خدا کی صفات میں تعدد ہے لیکن تمام صفات عین ذات ہیں۔ اور یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلی کا نام ہے لہٰذا اس اعتبار سے وہ بھی اپنے ظہور میں عین ذات ہے۔

کائنات کا وجود فی نفسہٖ کچھ نہیں۔ صرف اللہ تعالےٰ کی صفات کا ظہور ہے اور چونکہ صفات عین ذات ہیں۔ اس لئے کائنات اور خدا کی ذات میں عینیت کا علاقہ ہے اور خدا کی ذات چونکہ وحدت مطلقہ ہے اس لئے وجود وحدت ہی وحدت کا ہے۔ پس یہی وحدت الوجود یا ہمہ اوست کا نظریہ ہے جو اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

ابن عربی کہتے ہیں اللہ تعالےٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ کہ ہم انسان سے اسکی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس قربت

کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی انسان کے اعضاء جوارح کا اصل ہے اس لئے خدا اور انسان میں عینیت ہے۔ اسی طرح حدیث میں بھی آتا ہے خلق الآدم علیٰ صورتہ یعنی اللہ تعالےٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ انسان میں اللہ تعالےٰ کی تمام صفات موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انسان کو اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے کی توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ اپنے نفس کی معرفت اللہ تعالےٰ کی معرفت کے حصول کا ذریعہ ہے مَنْ عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

وحدت الشہود گیارہویں صدی ہجری میں جناب مجدد الف ثانی نے شیخ اکبر کے وحدت الوجود کے عقیدے کی تردید کی۔ شیخ اکبر ابن عربی کا استدلال یہ تھا کہ ذات۔ صفات کی عین ہے۔ کائنات۔ صفات کی تجلی ہے اور چونکہ صفات۔ عین ذات ہیں۔ اس لئے کائنات بھی عین ذات ہے

جناب مجدد نے فرمایا۔ صفات۔ عین ذات نہیں بلکہ زائد علی الذات ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا وجود فی ذاتہٖ کامل ہے اسے اپنی تکمیل کے لئے صفات کی احتیاج نہیں۔ صفات اس کے وجود کے تعینات ہیں۔ وہ موجود ہے لیکن اس کا وجود خود اس کی ذات سے ہے وہ سمیع ہے اپنی ذات سے وہ علیم ہے اپنی ذات سے۔ وہ بصیر ہے۔ اپنی ذات سے۔ غرض اللہ تعالےٰ کی صفات۔ عین ذات نہیں بلکہ اس کی ذات کے اظلال ہیں۔

پس مجدد صاحب کے اس نظریئے سے یہ معلوم ہوا کہ کائنات اس کی صفات کی تجلی کا نام نہیں بلکہ اس کی صفات کا ظل یعنی پرتو یا سایہ ہے۔ اور ظل کبھی عین اصل نہیں ہوتا اور مظہر کبھی عین ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ ہے مجدد صاحب کا وہ نظریہ جسے عقیدہ وحدت الشہود

کہتے ہیں۔

بقول مولانا شبلی علیہ الرحمہ کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریے میں فرق یہ ہے کہ وحدت الوجود کے عقیدے کے لحاظ سے ہم ہر شئے کو خدا کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح حباب اور موج کو بھی پانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وحدت الشہود میں یہ اطلاق جائز نہیں۔ کیونکہ جس طرح انسان کے سائے کو انسان کہنا محال ہے اسی طرح اظلال صفات کو خدا نہیں کہا جا سکتا۔

مظہر کے عین ظاہر نہ ہونے کے باب میں جناب مجددؒ فرماتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک صاحب فن اپنے طرح طرح کے کمالات کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ حروف و اصوات ایجاد کرتا ہے۔ یہ حروف و اصوات کمالات کا آئینہ بن کر کمالات کے ظہور کا باعث بنتے ہیں لیکن ان حروف و اصوات کو جو مرایائے کمالات ہیں عین کمالات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پس یہ بات قطعی طے ہو گئی کہ اس کائنات کو صفاتِ ذات کا مظہر تسلیم کر لینے سے بھی مظہر عین ظاہر ثابت نہیں ہو سکتا۔

شیخ اکبر نے کائنات کی نفی سے وحدت کے وجود پر جو استدلال کیا ہے جناب مجدد کے نزدیک یہ بات شیخ نے مقام فنا میں کہی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب صوفی اس مقام سے کسی بلند تر مقام پر پہنچتا ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے فنا کے مقام میں محبوب کی محبت کے غلبے کے باعث ہر چیز مستور ہو جاتی ہے اور چونکہ صوفی محبوب کے علاوہ کسی کو دیکھتا ہی نہیں اس لئے وہ محبوب کے سوا کسی شئے کو موجود نہیں پاتا۔

اگرچہ شیخ اکبر نے اثبات باری تعالےٰ سے کائنات کی نفی پر استدلال کیا ہے تاہم جناب مجدد کہتے ہیں کہ ذات باری تعالےٰ کے اثبات سے کائنات کے وجود سے انکار لازم نہیں آتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص آفتاب کے وجود کا یقین رکھتا ہے تو اس یقین محکم سے یہ لازم نہیں کہ وہ آفتاب کے چمکنے پر ستاروں کو پیش نظر نہ پاکر سرے سے ان کے وجود ہی سے انکار

کر دے۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ستارے ہیں۔ لیکن آفتاب کے نور کی تابش سے مستور ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ ان کے وجود کا منکر نہیں ہو سکتا اسی طرح ذات باری تعالےٰ کے اثبات سے کائنات کی نفی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت وجود کائنات کی نفی کرنا تعلیمات اسلام کے یکسر خلاف اور منشائے وحیٔ الٰہی کے بالکل برعکس ہے۔

مجدّد صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کائنات کا وجود نہ ہو تو جملہ اوامر و نواہی سب کے سب عبث و بیکار ٹھہرتے ہیں۔ ان کا پھر کوئی معنی و مقصد سمجھ میں نہیں آتا اور تمام عقائد باطل ہو جاتے ہیں غرض عذاب و ثواب۔ جزا و سزا۔ اجر و گناہ دین و دنیا عقبیٰ و آخرت یہ تمام باتیں بے معنی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر کائنات کا واقعی کوئی وجود نہیں تو پھر خدا نے کس شئے کو بنایا۔ اس کی وہ کیا مخلوق ہے جس کا وہ خالق ٹھہرا۔ ؟ پس یہ ماننا پڑے گا کہ کائنات کا وجود ہے

آیۂ قرآنی نحن اقرب الیہ من حبل الورید کہ ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس سے شیخ اکبر نے "قربت"، کو "عینیت" قرار دیا ہے۔ مجدّد صاحب نے اس سے بھی اختلاف کیا ہے۔ آپ کے نزدیک قربت کو عینیت خیال کرنا صحیح نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب اس کی کیفیت کا فہم و ادراک ہماری سمجھ سے باہر ہے —— ہمارے دماغ اور ذہن اس کے مفہوم کا تعین کس طرح کر سکتے ہیں اور قربت کو۔ کیونکر عینیت قرار دے سکتے ہیں۔ نیز اس حدیث نبوی کے بارے میں خلق الآدم علےٰ صورتہٖ کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ مجدّد صاحب کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اللہ تعالےٰ کی صفات کا مجسّمہ ہے یا انسان عین خالق ہے بلکہ اس سے کہنا یہ ہے کہ "روح ربانی"، کی طرح "روح انسانی"، بھی لامکانی ہے اور اسی اعتبار سے دونوں میں مشابہت ہے۔

بصورت دیگر خالق و مخلوق میں قطعاً کوئی عینیت نہیں ہو سکتی مجدد صاحب فرماتے ہیں ایک مکڑی جو بڑے حزم و احتیاط سے اپنا جالا بناتی ہے اس ذات سے کیونکر عینیت کا دعویٰ کر سکتی ہے جو پلک جھپکنے میں زمین و آسمان کو درہم برہم کر سکتی ہے

مجدد صاحب کے نزدیک من عرف نفسہ فقد عرف ربہ سے بھی انسان کا عین خدا ہونا ثابت نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ معرفت نفس کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے نقائص و معائب کو معلوم کر لیا ہے اس پر حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ تمام کمالات و محاسن اس کی ذاتی کوششوں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم سے حاصل ہوتے ہیں۔ تمام کمالات و محاسن کا اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سرچشمہ ہے اور صرف اسی نقطہ نظر سے معرفت نفس اللہ کی ذات کی معرفت کا ذریعہ قرار پا سکتی ہے۔

کائنات کے پیدا کرنے کی غرض کے بارے میں شیخ اکبر نے جو یہ حدیث نقل کی ہے اور اس پر وحدت کے وجود کا استدلال کیا ہے کہ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔ کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ اس استدلال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں کامل نہیں اس لئے وہ اپنی ذات کی تکمیل کے لئے تخلیق کا محتاج ہوا (اور احتیاج کا پایا جانا رب کی شان کے خلاف ہے) اور یہ خیال تعلیم دین کے خلاف ہے اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تخلیق کا مقصد معرفت نہیں۔

اللہ تعالیٰ خود اپنے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ وہ عالمین سے غنی ہے یعنی بے نیاز ہے۔ ان اللہ لغنی عن العالمین کائنات کی تخلیق کے مقصد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

حاصل کلام یہ کہ مجدّد صاحب نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وحدت الوجود کا نظریہ اسلام کی شریعت کے یکسر خلاف ہے کیونکہ اس عقیدے کی رو سے مخلوق بے وجود ہو جاتی ہے حالانکہ قرآن حکیم نے مخلوق کو جابجا ذی وجود کہا ہے۔

مجدّد صاحب کے نزدیک یہ کائنات۔ ظلِ صفات ہے۔ صفات۔ اظلالِ صفات ہیں۔ کائنات چند منازل تنزلات و تعینات سے وجود میں آئی ہے وہ اس طرح کہ وجود مطلق۔ وصفِ وجود کی علّت ہے وصفِ وجود سے صفتِ حیات اس سے صفتِ علم۔ اس سے صفتِ قدرت۔ پھر صفتِ ارادہ پھر صفتِ سمع۔ پھر بصر۔ اس کے بعد صفت کلام اور صفتِ تکوین کا ظہور ہوا اور صفتِ تکوین تخلیقِ کائنات کا باعث ہوئی۔

سلسلۂ نقشبندیہ کی خصوصیات

• نقشبندی سلسلہ جسے ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ نے قائم کیا۔ اور ان کے بعد آپ کے مرید یگانہ روزگار جناب مجدّد الف ثانی نے اسے ترقی دی یہ سلسلہ اسلام کی شریعت کے عین مطابق ہے۔ تصوّف کے دوسرے سلسلوں کی طرح اس میں شریعت اسلامی سے مطلقاً کوئی آزادی نہیں۔ مثلاً سجدہ تعظیمی۔ قبروں پر روشنی غلاف اور چادر ڈالنا۔ پیروں کے قدم چومنا۔ مرید عورتوں کا اپنے پیروں سے بے پردہ رہنا غرض اس قسم کی تمام باتوں کی قطعاً اجازت نہیں۔ نقشبندی سلسلے میں یہ تمام باتیں شریعت اسلام کے بالکل خلاف ہیں،

اس کے علاوہ چلّہ کشی۔ ذکر بالجہر اور سماع بالمزامیر وغیرہ مراسم اختیار کرنے بھی مناسب نہیں سمجھے جاتے۔ نقشبندیوں کو صحابہ کرام کی سی زندگی۔ انہی کی طرح بودوباش وضع قطع اور معاشرت اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور نقشبندی سلسلے میں صحابہ کرام تمام اولیائے عظام سے افضل مانے جاتے ہیں المختصر شریعت اسلام کی تمام و کمال پیروی کرنا اس مسلک کی بنیاد اوّلیں ہے چنانچہ اس سلسلے میں جناب مجدّد فرماتے ہیں۔ بعض درویشوں

پر مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ شریعت کی مخالفت پر جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت وہ شے ہے کہ اگر جناب علیٰؑ دوسرے بھی ہمارے پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوتے تو وہ بھی اس شریعت کے تابع ہوتے۔"

المختصر نقشبندی سلسلہ جناب مجددؒ کی مساعی سے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گیا اور ہندوستان سے باہر بھی نقشبندی سلسلے کے مراکز قائم ہوئے جنہیں آپ کے بے شمار خلفاء و مریدین نے آپ کے بعد اپنی کوششوں سے مضبوط و مستحکم کیا۔

جناب مجددؒ مکتوبات کے آئینہ میں

ردِ بدعت۔ مخالفتِ تشیع اور احیائے اسلام یہ تین موضوع جناب مجددؒ کی تمام تر مساعی کا ماحصل ہیں۔ آپ کے مکتوبات کے مضامین انہی تین امور پر مشتمل ہیں۔ وہ لوگ جو گوشہ تنہائی میں تسبیح لئے بیٹھے تھے جن کو دنیا کے کاموں سے مطلق کوئی سروکار نہ تھا۔ جن کو صرف گوشہ عافیت ہی میں بھلائی نظر آتی تھی جناب مجددؒ نے انہیں دلیر کیا۔ ان کی ہمت بندھائی اور ان سے کہا کہ یہ وقت نہیں ہے کسی کونے یا گوشے میں جا کر بیٹھ رہنے کا۔ یاد خدا کرنا ہے تو میدانِ عمل میں آؤ تسبیح کے دانے بکھرے ہوئے ہیں انہیں قوتِ عمل سے پرونے کی ضرورت ہے اٹھو اور خدا کی راہ میں جہاد کرو کہ اس وقت یہ جہاد ہزار عبادتوں کی ایک عبادت ہے کفر کی طاقت بڑھتی چلی جا رہی اگر وقت پر اس کی مدافعت نہ کی گئی تو یاد رکھو کہ تم دنیا سے مٹ جاؤ گے اور کہیں تمہارا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔

جناب مجددؒ کے حساس دل پر خلاف اسلام واقعات کا بڑا اثر تھا اس لئے وہ نہ صرف بادشاہ کے مخالف تھے بلکہ غیر مسلموں سے بھی سخت نفرت کرتے تھے اور جذبۂ انتقام ہر وقت ان کو بے چین کئے رکھتا تھا۔

اگرچہ اکبر کا دور ختم ہو چکا تھا۔ جملہ معترضہ کے طور پر اکبر کے بارے میں یہ بات مکرر سمجھئے کہ وہ کفر سے تائب ہو کر مرا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے مرتے وقت کلمہ شہادت دہرایا۔ سورہ یٰسین پڑھوا کر سنی عرض اکبر کے بعد شہنشاہ جہانگیر کا دور حکومت شروع ہوا۔ اور جہانگیر بھی کون؟ اکبر کا وہ بیٹا جو اکبر کے دین الٰہی کو پھیلانے اور اس کے ممد و مددگار بننے والے ابو الفضل ایسے لوگوں کا سخت مخالف بلکہ جانی دشمن تھا اور وہ جہانگیر جسے خواجہ باقی باللہ کے رکن السلطنت نواب مرتضٰے خاں شیخ فرید ایسے با اثر مرید نے صرف اس شرط پر اپنی ذات کا اعتماد بہم پہنچایا اور اس کی تخت نشینی کا اہتمام کیا تھا کہ وہ اسلام کی شریعت کے خلاف نہ چلے گا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہندوؤں کی ناشائستہ اور دلآزار حرکتیں دن پر دن بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ جناب مجددؒ کے حساس دل پر ان اخلاق سوز ناشائستہ حرکات کا گہرا اثر تھا۔ ان باتوں کے سبب نہ صرف بادشاہ کے خلاف تھے بلکہ ان کو ہندوؤں سے بھی سخت نفرت تھی یہاں تک کہ ہندوؤں سے انتقام لینے کا جذبہ انہیں ہر وقت بے چین کئے رکھتا تھا چنانچہ شیخ فرید کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کفار بے تحاشا مسجدوں کو شہید کر کے وہاں مندر بنا رہے ہیں۔ تھانیسر میں حوض کرکھیت کے درمیان ایک مسجد اور ایک بزرگ کا مقبرہ تھا۔ اسے گرا کر اس کی جگہ بڑا بھاری مندر تعمیر کرایا ہے اس کے علاوہ کفار اپنی رسموں کو کھلم کھلا ادا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ان کی شرارتوں اور مخالفتوں کے سبب اکثر اسلامی احکام کے بجالانے سے قاصر ہیں ایکادشی کے دن ہندو کھانا ترک کر دیتے ہیں کہ اسلامی شہروں میں بھی کوئی مسلمان اس روز روٹی نہ پکائے اور نہ بیچے اور ماہ رمضان المبارک میں ہندو برملا نان و طعام پکاتے اور بیچتے ہیں مگر اسلام کے مغلوب ہونے کے باعث انہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ ہائے افسوس بادشاہ وقت ہم میں سے ہو اور پھر ہم فقیروں کا اس طرح خستہ اور خراب حال ہو۔ ایک خط میں انہی کے نام یوں لکھتے ہیں۔ پس اسلام کی عزت۔ کفر اور کافروں

کی ذلت میں ہے۔ جس نے کافروں کو عزیز رکھا پس اس نے اسلام کو خوار کیا۔ کفار کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی مراد نہیں۔ بلکہ اپنی مجلسوں میں جگہ دینا۔ ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور کرنا چاہئے۔ اور اگر دنیاوی غرض ان سے کوئی ہو اور بغیر ان کے حاصل نہ ہوتی ہو تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مد نظر رکھ کر ضرورت کے مطابق ان سے میل جول رکھنا چاہئے اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض سے بھی درگزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں اسلام اور مسلمانوں کی عزت۔ کفر اور کافروں کی ذلت میں ہے جزیہ سے مقصود کافروں کی خواری اور ان کی اہانت ہے جس قدر اہل کفر کی عزت ہو۔ اسی قدر اسلام کی ذلت ہوتی ہے اس سر رشتہ کو اچھی طرح سے نگاہ میں رکھنا چاہئے اکثر لوگوں نے اس سر رشتہ کو گم کر دیا ہے اور دین کو برباد کیا ہے۔

شیخ فرید کانگڑہ کی فتح پر مامور تھے۔ اس علاقہ میں ہندوؤں کا ایک بہت بڑا تیرتھ تھا۔ جس میں پرانی مورتی تھی۔ جناب مجدد چاہتے تھے کہ شیخ فرید اس کے توڑنے کی سعادت حاصل کریں چنانچہ لکھتے ہیں ” ان بدبختوں اور ان کے جھوٹے خداؤں کی تحقیر و توہین میں بہت کوشش کرنی چاہئے۔ اور ظاہر و باطن میں جس قدر ہو سکے ان لوگوں کی بربادی و تباہی کا سامان پیدا کرنا چاہئے اور اس تراشیدہ و ناتراشیدہ بت کی ہر طرح سے اہانت کرنی چاہئے۔ امید ہے کہ بعض کوتاہیاں جو آپ سے وقوع میں آئی ہیں اس ان کی تلافی اور کفارہ ادا ہو جائے۔

بدن کی کمزوری اور سردی کی شدت مانع ہے ورنہ فقیر خود حاضر خدمت ہو کر اس امر کی ترغیب دیتا اور اس تقریب سے اس پتھر پر تھوکنا اور اسے اپنی سعادت کا سرمایہ جانتا۔“

جناب مجدد مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں بظاہر ایک متشدد و متعصب

شخصیت نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایسے نہیں تھے چنانچہ اس خیال کے تحت وہ مرزا جعفر بیگ کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ میرے مخدوم جب کفارِ قریش نے اپنی کمال بدنصیبی سے اہل اسلام کی ہجو اور برائی میں مبالغہ کیا تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے شاعروں کو حکم دیا کہ وہ کفار نگو نسار کی ہجو کریں" اس خط کے بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جناب مجدد الف ثانی" کا یہ نقطۂ نظر ہندوؤں کے خلاف ان کی جارحانہ کارروائیوں کے باعث قائم ہؤا اصل میں اکبر نے ہندوؤں کی جو تالیف قلوب کی یعنی انہیں جزیہ معاف کر دیا اور انہیں خوش کرنے کے لئے مسلمانوں پر گائے کی قربانی دینا خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس سے ہندوؤں میں ہندو مذہب کے احیاء کی تحریک زور پکڑ گئی۔ قریب تھا کہ ہندو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے کہ عین وقت پر جناب مجدد مقابلے پر آگئے اور انہوں نے طرح طرح کی صعوبتیں اور قید و بند کی مشقتیں اٹھا کر مسلمانوں کو برگشتگی سے بچا لیا۔ ورنہ اکبر کے ملحدانہ خیالات کا سہارا لے کر ہندو تو چاہتے ہی یہی تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

دراصل ہندوؤں نے جہاں تک ظلم و تعدّی سے ہو سکا اس سے کام لے کر ہندوستان کی ان قوموں کو اسلام سے پھیرنے کی بھرپور کوشش کی جو بزرگان دین کی ستودہ صفات اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے زیر اثر اسلام قبول کر چکی تھیں اور جہاں بس نہ چلا وہاں اسلام کو ضعف پہنچانے کے لئے انہوں نے بھی اسی پالیسی کو اختیار کیا جیسے ان سے کہیں پہلے وہ عجمی اختیار کر چکے تھے جو صرف ہنگامی حالات کے تحت مسلمان ہو گئے تھے مگر دل سے اسلام کی بھلائی نہیں چاہتے تھے بلکہ اندر ہی اندر اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے رہتے چنانچہ اسی پالیسی کے تحت ہردے رام ایک ہندو نے جناب مجدد کی خدمت میں دو خط لکھے تھے جس میں اس نے صوفیائے اسلام سے اپنی دلی

محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اصل میں رحمان اور رام ایک ہی ذات کے دو نام ہیں مگر جناب مجدد ہردو رام کے ان خطوں سے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بجائے فوراً اس کے خبث باطن کو تاڑ گئے۔ چنانچہ آپ نے اس کے خطوں کے جواب میں ایک نہایت تہدید آمیز خط ارسال کیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ " رام اور کرشن جو ہندوؤں کے معبود ہیں اللہ تعالےٰ کی کمینہ مخلوقات میں سے ہیں۔ اور ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ رام جسرتھ کا بیٹا تھا۔ لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا۔ جب رام اپنی بیوی کو نگاہ نہ رکھ سکا تو پھر وہ دوسرے کی کیا مدد کر سکتا ہے عقل دور اندیش سے کام لینا چاہئے اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی پر نہ چلنا چاہئے۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ تمام عالمین کے پیدا کرنے والے کو رام یا کرشن کے نام سے یاد کیا جائے۔ رام و رحمان کو ایک جاننا سخت نادانی ہے۔ جو شخص رحمان، رام کو ایک ہی ذات کے دو نام خیال کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی عظیم الشان بادشاہ کو " کمینہ خاکروب" کے نام سے یاد کرلے۔

خالق کبھی مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا۔ اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔" اس خط کے مضمون سے یہ بات قطعی واضح ہوگئی کہ جناب مجدد کے زمانے میں اکبر کے ملحدانہ خیالات کی بدولت ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت کیا تھی وہ کن احوال سے دوچار تھے اور کس دور سے گزر رہے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کی نصرت و حمایت کا سامان پیدا کیا اور اس الحاد و زندقہ سے مسلمانوں کو بچانے کے اپنے ایک بندے احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی کو قوت حق اور استقامت دین عطا کرکے باطل کی قوتوں کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔

اسلام کے تصوف پر ہندوستانی خیالات نے جس قدر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور اکبر کے ملحدانہ خیالات نے ہندوؤں کو جتنا بے باک اور اسلام کی دشمنی

میں بتزکر دیا تھا جناب مجدد الف ثانی نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پاکر ان سب قباحتوں کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا۔ بنا بریں جناب احمد سرہندی کو اسلام کے ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد دوسرے ہزار سالہ دور کا رہبر کہنا اور اسلام کی تعلیمات کی تجدید کرنے والا کہنا یعنی مجدد الف ثانی تسلیم کرنا یقیناً حق بجانب ہے۔

بحضرت شیخ الحدیث والتفسیر علامہ مولانا سید فرید الدین مفتی ہاشمی رحمۃ اللہ علیہ (ابن مولانا الٰہی بخش ابن مولانا حافظ غلام رسول ابن مولانا احمد یار ابن مولانا و سیدنا خواجہ سلطان محمود خراسانی والبخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ خواجہ حبر الامت مفتی مکہ رئیس المفسرین سیدنا عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب ابن ہاشم کی اولاد سے تھے)۔

نیازے داشتم در ہند با شیخے نکوکارے — فقیہے، عالمے، شیریں زبانے نغز گفتارے
فرید الدینؒ کہ در آئین پند و موعظت بودہ — تو گوئی در دیار خود فرید الدین عطارے
بہ تلقین طریقت ۔ بو حنیفہؒ زمن خود دیدم — در استیصال بدعت دیدمش معروف پیکارے
بخودش مقصد دیگر بغیر مصلحت کوشی — بہر ذکرے، بہر فکرے، بہر گامے بہر کارے

عقیدت کیش احسن ارتجالاً کردہ است انشا
بہ پاس خاطر فرزندزادش چند اشعارے

از: — مولانا سید منظور احسن عباسی —
— دہلوی سابق پروفیسر اردو، فارسی۔
— دینی سنگھ کالج سنگرور —

اللہ تعالےٰ مجھ کم علم و کم سواد کو میرے دادا علامہ فرید الدینؒ مفتی اور نانا مولانا حافظ چراغ الدین مفتی (برادر اصغر علامہ فریدؒ) کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق

عطا فرمائے شیخ المشائخ مولانا حمید الدینؒ۔ مولانا شاہ گنج بخش قادری۔ مولانا محمد مستقیم چشتی ملتانی مولانا شاہ محمد۔ مولانا احمد یار ابنان خواجہ سلطان محمود رحمہم اللہ تعالےٰ اجمعین کی قبور پر اپنی رحمت کے پھول برسائے کہ جن کی تبلیغی کوششوں کی بدولت ایک دنیا اسلام کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوئی آخر میں اپنے والد محترم جناب، مولوی غلام محمد مرحوم کے حق میں دعائے مغفرت کرتا ہوں جن کی یہ دلی خواہش تھی کہ میں اسلام کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنا کر خاندان کی روایات کو قائم رکھنے کی سعادت حاصل کروں۔

-: وما توفیقی الا باللہ :-

احقر العباد

سعدی سنگوروی

زندہ لوگوں کے لیے
زندہ کتابیں

اُردو میں کم خرچ کاغذی کتابوں (پاکٹ بکس اور پیپر بکس) کا سب سے معیاری سلسلہ جس کے انتخاب اور پیش کش میں مکتبہ جدید کا جانا پہچانا سلیقہ اور وسیع تجربہ کار فرما ہے

"مغربی دُنیا میں انگریزی علم و ادب کو عام کرنے میں پینگوئین کی سستی کتابوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ ہمارے یہاں ماضی میں مُنشی نول کشور لکھنؤ نے بڑی حد تک یہ کام کیا ہے۔ آج پھر یہ موقع ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق اُردو کے لیے کوئی یہی خدمت بجالائے۔ مکتبہ جدید کی سستی کاغذی کتابیں اسی اہم منزل کی جانب قدم بڑھا رہی ہیں۔ ان کتابوں کی چھپائی اچھی ہے اور گتے کی جلد مضبوط اور نظر افروز ہے۔ ہر طرح سے توقع ہے کہ ان کتابوں کا اُردو پڑھنے والے شاندار استقبال کریں گے۔"

(روزنامہ پاکستان ٹائمز، لاہور)

"ایک عرصے سے یہ شکایت ہو رہی ہے کہ ہمارے یہاں پڑھنے لکھنے کا شوق ختم ہو گیا ہے اور لوگوں کو علم و ادب سے دلچسپی نہیں رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ناشرین پُرانی لکیر کو پیٹتے چلے جاتے تھے۔ اب مکتبہ جدید نے سستی کتابوں کا کاغذی سلسلہ شروع کر کے علمی و ادبی دُنیا میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے۔ اب کوئی یہ شکایت نہیں کر سکتا کہ وہ مہنگائی کی وجہ سے کتابیں نہیں پڑھتا۔" (روزنامہ ڈان، کراچی)

"اُردو کتابوں کی غیر معمولی گرانی ایک ایسا مسئلہ ہے جو اکثر علم دوست اور مطالعے کے شائقین افراد کے لیے پریشانی کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ پھر اچھی کتابوں کی تعداد کم اور قیمت اکثر زیادہ ہوتی ہے۔ اب مکتبہ جدید نے انگریزی کتابوں کی طرح اردو میں بھی سستی اور معیاری کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے اور وہ اس میں بہت کامیاب ہے۔"

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور)

خانۂ کعبہ

محمد طاہر الکردی

ترجمہ : عبدالصمد صارم ۱۶۷۵

اِس مختصر لیکن نہایت اہم کتاب میں خانۂ کعبہ کی تعمیر، اُس کے حدود اور اضافوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اُس کے برگزیدہ معمار حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے حالات دیے گئے ہیں خانۂ کعبہ کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور فضائلِ کعبہ کی بحث درج کی گئی ہے تاکہ زائرین اور قارئین کے لیے مزید سہولت کا باعث ہو ـــــ اس موضوع پر اس نوعیّت کی یہ پہلی کتاب ہے جو خانۂ کعبہ سے متعلق ہر معاملے پر اتنی جامع معلومات کی حامل ہو۔

محمد رسول اللہ ﷺ

توفیق الحکیم

ترجمہ وتہذیب : عطیّہ افتخار اعظمی

۵٫۰۰

”عطیّہ خلیل عرب (عطیّہ افتخار اعظمی) نے جدید مصری ادیب و مؤرّخ توفیق الحکیم کی مشہور کتاب ”محمدؐ“ کا ترجمہ کرنے میں نہ صرف اصل کتاب کی تصنیفی خصوصیّات کو قائم رکھا ہے، بلکہ اپنے حواشی و استدراکات سے، جن کا اضافہ تاریخی حیثیّت سے ضروری تھا اس کو بالکل نئی صورت دے دی ہے۔“ (علّامہ نیاز فتح پوری)

”میرے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ جوانوں کے لیے خصوصًا اور عوام کے لیے عمومًا بہت مفید ہوگا اور مکالمے کے انداز کو وہ زیادہ دلچسپ پائیں گے۔“ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

کرنیں، شگوفے، پچھتاوے، مدّوجزر

شفیق الرّحمان

چار صحت مند اور حسین مجموعے

"سارے نئے ادب میں لے دے کے ایک شفیق الرحمان صاحب ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجّہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لاابالی پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس انہی کا حصہ ہے"

(محمّد حسن عسکری)

"شفیق الرحمان کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سرخ، سرخ، نارنجی، یا قوتی، زعفرانی"

(کرشن چندر)

"شفیق الرحمان موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کا بانی ہے"۔ (ادبِ لطیف)

"شفیق الرحمان محض مزاح نگار نہیں ہیں۔ وہ زندگی کی پُرسوزی سے بھی اتنے ہی قریب ہیں جتنے اس کے طربیہ پہلو سے۔ فرق صرف یہ ہے کہ زندگی کے جاں گداز غم نے ان کے بلند تخلیقی جذبات کو مضمحل نہیں کیا، بلکہ ان کی رومانی کہانیوں کو مزاح کی سنہری لہر نے عظیم تر بنا دیا ہے"

(سیّد احتشام حسین)

"شفیق الرحمان کی کہانیوں میں تکلّف اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ ان کے رومانی اور شگفتہ افسانوں میں بے ساختگی اور روانی ہے"

(حجاب امتیاز علی)

کرنیں	شگوفے	پچھتاوے	مدّوجزر
۲٫۲۵	۲٫۲۵	۲٫۲۵	۱٫۷۵

شبنم ۳۶۰۰ گریز ۳۶۰۰

عزیز احمد

(دو ناول)

عزیز احمد اردو کے سب سے مشہور اور ممتاز ناول نگار ہیں۔ اُن کے ناول نئے ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں۔ عزیز احمد کو ناول کی تکنیک پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے اور وہ کرداروں کی تشکیل اس چابکدستی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو وہ جیتے جاگتے محسوس ہونے لگتے ہیں۔

شبنم ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس نے عشق کیا ہے لیکن جس کے کردار کے گرد ماحول نے عجیب و غریب افسانے بُن رکھے ہیں حسن عشق اور موت — اس ازلی مثلث کے تمام زاویے عزیز احمد نے بڑی مہارت سے اپنے اس بلند پایہ اور دلچسپ ناول پر چھاپ کر دکھائے ہیں۔

گریز دو بڑے اعظموں کی پامال اور فرسودہ تہذیب کی داستان ہے۔ ایسی تہذیب جس کی بنیادیں تصنع، بناوٹ اور ریاکاری پر رکھی گئی ہیں گریز کا ہیرو مستقبل کا انسان ہے جس کی آنکھیں نہ مشرق کو دیکھتی ہیں نہ مغرب کو بلکہ اس نئے افق پر مرکوز ہیں جہاں صبح کاذب کے دھندلکے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

ایک محبت سو افسانے

اشفاق احمد

زندہ کتابیں ۲۷۵

مجلد اڈیشن ۵۰۰

"اشفاق احمد اردو افسانے کے سجیلے دولھا ہیں۔ انھیں محبت کے ایک ایک زاویے کی خبر ہے اور وہ ان خبروں کو ایسے پیارے میٹھے اور رسیلے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کے افسانے سعادت حسن منٹو کے بقول برفی کی ننھی منی ڈلیاں محسوس ہوتے ہیں۔

مادام بوواری

۴ء۰۰

گستاؤ فلوبیئر (ناول) ترجمہ: محمد حسن عسکری

یہ ایک ایسی عورت کی بدکاریوں اور خود فراموشیوں کی داستان ہے جو عشق اور عیش و طرب کی تلاش میں اپنے رومانی خوابوں کی تعبیر کی تلاش میں اپنے خاوند، اپنی بیٹی، اپنے گھر بار، اپنی عزت نفس — ہر چیز کو اپنے محبوب عاشقوں پر اس طرح نچھاور کر دیتی ہے جیسے وہ بھی اس کے گرما گرم والہانہ بوسے ہیں یا اس کی بے تاب آغوش محبت، لیکن جیسے آخر کار یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز سرتاسر جھوٹ ہے، ہر مسکراہٹ کے پیچھے اکتاہٹ کی جمائیاں چھپی ہیں، ہر مسرت ایک لعنت ہے، ہر لذت میں سیری ہے اور شیریں سے شیریں بوسے ہونٹوں پر کسی اور بھی بڑی مسرت کی کبھی پوری نہ ہونے والی آرزو چھوڑ جاتے ہیں۔

"جب یہ کتاب آج سے سو سال پہلے شائع ہوئی تو اس پر فحاشی کے سلسلے میں مقدمہ چلا، لیکن دنیائے ادب کی خوش قسمتی سے یہ کوشش رائیگاں گئی ورنہ آج ہم ایک عظیم تخلیق سے محروم ہوتے۔"

(ماہنامہ ادب لطیف لاہور)

سرخ و سیاہ

(ایک جلد میں مکمل)

۷ء۰۰

ستاں دال (ناول) ترجمہ: محمد حسن عسکری

"یہ عظیم ناول ایک جوان پادری کے عشقیہ کارناموں کے روپ میں دورِ حاضر کے انسان کے دل و دماغ کا منہ بولتا آئینہ ہے۔ "سرخ و سیاہ" کا شمار دنیا کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے۔"

(سمرسٹ ماہم)

بُوڑھا اور سمندر

۱۶۵۰

ارنسٹ ہیمنگوے (ناول) ترجمہ: بشیر ساجد

اِس ناول کا ہیرو ایک بڈھا مچھیرا ہے جسے کئی ہفتوں سے شکار نہیں ملا۔ آخر وُہ گہرے سمندر میں جا نکلتا ہے اور ایک دیو ہیکل مچھلی اُس کے کانٹے میں پھنس جاتی ہے پھر کئی دن رات اِنسان اور فطرت کے درمیان وُہ کش مکش بپا رہتی ہے جس نے اس ناول کو اِنسانی زندگی اور اُس کے مقدّر کا طویل استعارہ بنا دیا ہے۔

اِنسان اور فطرت، اِنسان اور مقدّر کی اِس کش مکش میں جیت کس کی ہوتی ہے؟ ——— یہی وُہ ازلی و ابدی سوال ہے جس کا درد بھرا جواب یہ نوبل اِنعام یافتہ ناول پیش کرتا ہے۔

بُڈّھا گوریو

۳۶۵۰

بالزاک (ناول) ترجمہ: سیدہ نسیم ھمدانی

بُڈھا گوریو اپنی شوقین مزاج بیٹیوں پر جان چھڑکتا تھا۔ اُس کی بیٹیاں شوہروں کو چھوڑ دیں، اپنے عاشقوں کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں، گوریو کی پائی پائی اُڑا دیں، بس اُنہی کی خُوشی میں گوریو کی خُوشی تھی۔ اُسے تو اُن کے عاشقوں سے خُود بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا تھا اور اِس خیال سے اُسے راحت ملتی تھی کہ اس کی کوششوں کے نتیجے میں یہ محبّت کرنے والے یکجا ہو جاتے تھے۔ اُس کی بے غرضانہ محبّت میں ایک طرح کی عظمت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کی دِل چسپ داستان بڑے گہرے سوال اُٹھاتی ہے کہ کیا بے غرض محبّت ہلاکت کا دُوسرا نام ہے، کیا عظیم شخصیت کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے، کیا رُوحانی بلندی مضحکہ خیز بھی ہو سکتی ہے، اِنسانی زندگی طربیہ ہے یا المیہ؟

زندگی کا راستہ — کامیابی کا راستہ

۲٫۲۵ — ۳٫۰۰

ڈاکٹر بوس ٹیس چیسر

ترجمہ: میاں عبدالرشید

زندگی کا راستہ نوجوانوں کی رفاقت کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ اردگرد پھیلی ہوئی اس صد رنگ و سنگین دنیا سے مطابقت پیدا کر سکیں۔ اس میں دوستی، جنس، انفرادی اور سماجی مقاصد میں کھینچا تانی، زندگی کے مادی نظریے سے ماورا کی ضرورت، والدین اور اساتذہ سے تعلقات اور مستقبل پر وضاحت، متانت اور اخلاص سے بحث کی گئی ہے۔

کامیابی کا راستہ اُن لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے جنھیں طرزِ عمل اور انفرادی، ازدواجی، سماجی تعلقات کے بارے میں کسی تجربہ کار اور ہمدرد ماہرِ نفسیات کے مشوروں کی خواہش ہے۔ اس کا انداز سراسر عملی ہے۔ اس کا مطالعہ خوش اور کامیاب افراد اور معاشرے کی تعمیر میں حصہ لے گا۔

آدابِ زندگی

محمد اقبال سلمان

۲٫۰۰

"زندگی بسر کرنے کا فن اس قابل ہے کہ اسے عمدہ فنون میں شمار کیا جائے۔ علم و ادب کی طرح اسے بھی انسانی فضائل میں سے ایک فضیلت سمجھنا چاہیے۔ یہ فن معاشرتی وسائل سے بہترین طور پر فائدہ اٹھانے، زندگی کی بلند ترین مسرتوں سے لطف اندوز ہونے اور اس کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔"

محمد اقبال سلمان کی یہ مشہور کتاب سموئیل سمائلز کے انھی الفاظ کی ترجمان ہے۔

جینے کا قرینہ ۰۰ء۳

آندرے موروا
ترجمہ: مختار صدیقی

جینا انسان کے لیے سب سے اہم کام ہے۔ ہر کام کی طرح جینے کا قرینہ بھی ہمیں سیکھنا ہی چاہیے۔ آندرے موروا فرانس کے بہت ہی مشہور ادیب ہیں۔ تخلیقی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کرنے کے فن پر بھی اُن کی بڑی گہری نظر ہے۔ چنانچہ اس کتاب کو نہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے باذوق حضرات بھی نہایت دل چسپی اور لطف سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہمیں وہی فیضان نصیب ہوتا ہے جو کسی مشفق و محترم بزرگ کی صحبت میں بیٹھ کر سیکھنے سے ہو سکتا ہے۔

اپنا راستہ خود بناؤ ۲۵ء۲

فائق کامران

اپنا راستہ خود بناؤ ایک ایسی کتاب ہے جو آپ کو کسی خشک مزاج اُستاد کی طرح اخلاقیات کا درس نہیں دیتی بلکہ ایک مخلص دوست کی طرح آپ کی مشکلات میں آپ کی رہنمائی کرتی ہے اور آپ کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے آزادانہ عمل کا راستہ بتاتی ہے۔

کیا آپ کاروبار کرتے ہیں؟

سید اعجاز حسین

۲۵ء۲

دوسرے کاموں کے مقابلے میں کاروبار کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے ــــ لیکن آپ بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہوں گے جو ایک عرصے سے کاروبار کر رہے ہیں پھر بھی حسب دلِ خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ نہ تو انھوں نے سرمایہ ہی اکٹھا کیا ہے نہ کسی خاص شعبے میں ناموری حاصل کی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ انھی کے بھائیوں، انھی کے ہمسایوں، انھی کے احباب نے اپنے کاروبار کے بل پر عزت بھی حاصل کی ہے اور امیر کبیر بھی بن گئے ہیں؟ یہ کتاب کاروباری کامیابی کا راستہ ہموار کرتی ہے۔

روزمرّہ آداب (ایٹی کیٹ)

الطاف فاطمہ

۲۶۰۰

روزمرّہ معاشرتی زندگی میں ایسے مواقع عام پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں کو لوگوں سے ملنا ملانا پڑتا ہے۔ یہ مواقع اس بات کا امتحان ہوتے ہیں کہ ہم کتنے مہذب یا کتنے سوشل ہیں۔ یہ مستند اور جدید کتاب زندگی میں میل ملاپ کے ہر موقعے کے لیے صحیح ترین ہدایات کا ذخیرہ ہے۔ اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے آپ ہر موقعے پر ماحول کی نگاہ میں پسندیدہ اور ہر دلعزیز ٹھہریں گے۔

الطاف فاطمہ اردو کی جانی پہچانی افسانہ نگار ہیں اور لاہور کے ایک کالج میں پڑھاتی ہیں۔ ان کی یہ کوشش ہماری گھریلو اور مجلسی زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے میں نمایاں حصّہ لے گی۔

امتحانوں کی تیاری

کولن ای۔ وڈلے

۱۶۵۰

بیشتر طلبہ یہ نہیں جانتے کہ مطالعہ کرنے اور یاد رکھنے کا کیا طریقہ ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کلاس میں اور گھر میں نوٹس کس طرح بنائیں۔ انھیں توجّہ کو مرکوز کرنا نہیں آتا۔ انھیں چیدہ چیدہ عبارتوں کو حفظ کرنا نہیں آتا، انھیں یہ پتا نہیں ہوتا کہ کب پڑھنا چاہیے اور کب آرام کرنا چاہیے۔ انھیں کمرۂ امتحان اور مُباحثوں میں دماغ کو حاضر رکھنے کی عادت نہیں ہوتی۔ یہ کتاب یہ سب باتیں سکھاتی ہے۔

تیغِ ستم

شفیع عقیل

۲/۰۰

(طنز و مزاح)

شفیع عقیل نے ہماری روزمرّہ کی زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اس نفاست سے بے نقاب کیا ہے کہ ہم ان پر ہنستے تو ہیں ہی، ساتھ ہی اپنے گریبان میں جھانکنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان تحریروں کی ستم ظریفی یہی ہے کہ یہ دُوسروں کے بارے میں ہوتے ہُوئے بھی ہمارے بارے میں بہت کچھ نشتر کر جاتی ہیں۔

شفیع عقیل کراچی کے روزنامہ "جنگ" میں کام کرتے ہیں اور اس میں "گرد و پیش" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ اسی مقبول کالم کا انتخاب ہے۔

رُستم و سُہراب

آغا حشر

۱/۲۵

(ڈراما)

رُستم و سُہراب ایک پُرانی کہانی ہے، لیکن یہ آج کی کہانی بھی ہے۔ آج بھی دُنیا اور دُنیا کے لوگ اہلِ جوہر کی پامالی کے اسی طرح درپے ہیں، جس طرح پہلے تھے۔ آج بھی سیاست گر، رستموں کو ورغلا کر سہرابوں کو راہ سے ہٹانے میں مصروف ہیں۔ آج بھی انسان دُنیا کے دھندوں میں اپنی متاعِ حیات لُٹاتا چلا جاتا ہے۔ آغا حشر کے اس کھیل میں زبان و بیان کا چٹخارہ ہی نہیں دورِ حاضر کے ایک اہم موضوع کے تار بھی ہلائے گئے ہیں۔

اقتصادی ترقّی کا منظر و پس منظر

جان کینتھ گالبریتھ

ترجمہ و تمہید: حنیف رامے

زندہ کتابیں: ۱۷۵ء۱ مجلد اڈیشن: ۴۰۰ء

ہمارے عوام، ہمارے اخبارات، ہماری حکومت ــــ سب کا فیصلہ ہے کہ پاکستان کا معیارِ زندگی بلند ہونا چاہیے۔ معیارِ زندگی اِسی طرح بلند ہو سکتا ہے کہ ہم اقتصادی ترقی کریں۔ اقتصادی ترقّی کیسے ہوتی ہے، اس کے کیا اصُول اور کیا طریقے ہیں؟ یہ وُہ اہم سوال ہے جس سے یہ اہم کتاب بحث کرتی ہے۔ گالبریتھ نے اپنی اس آئینے کی طرح صاف بحث کو بہت مختصر اور بہت عام فہم انداز سے پیش کیا ہے۔ حنیف رامے نے ترجمے کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس بحث سے مُلکی مُعاملات پر جو روشنی پڑتی ہے، اس پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

دس پیغمبرؑ

۲۵۰ء

بشیر احمد سعدی

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کے ہوتے ہُوئے بھی عوام النّاس پیغمبروں کے حالات سے قصص الانبیاء جیسی بے سرو پا کتابوں ہی کے ذریعے واقف ہیں۔ اس کتاب میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اللہ کے برگزیدہ نبیوں کے وُہی حالات درج کیے جائیں جن کی صداقت پر قرآن کی مہر لگی ہو۔ اِس مُستند کتاب میں حضرت نوحؑ، حضرت ہُودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یُوسفؑ، حضرت مُوسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کے مثالی سوانح پیش کیے گئے ہیں۔

پیار کی دیوی

۲۶۷۵

پیئر لوئی

ایک وقت تھا کہ حُسن آزاد تھا اور عشق بے باک۔ اُس وقت حُسن اور عشق کا وصال ایک عبادت تھا۔

یہ کہانی اُسی وقت سے تعلّق رکھتی ہے۔ فرانس کے نامور مصنّف: پیئر لوئی نے ہمارے لیے اُسی بھولے بسرے وقت کو تازہ کیا ہے جب انسان، پیار کی دیوی: ایفرودت، کے مہربان سائے میں محبّت کی تانیں اُڑانے میں مگن تھا۔ حُسنِ مجسّم: کرائسس کے گرد بُنی ہُوئی یہ رس اور رنگ بھری داستان ہمیں ہمارے سنگین اور سفّاک ماحول سے اُٹھا کر اپنی دُنیا میں لے جاتی ہے: وہ دُنیا جو آرزوؤں کا ایک بے پایاں سمندر ہے، آرزوؤں کے ساتھ ساتھ چڑھتا اور اُترتا سمندر۔

شاہد چشتی نے اِس خوب صورت کتاب کا بہت خوب صورت ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب زندگی کے حُسن کو نکھارتی ہے اور عشق کے قیمتی جذبے کو سیراب کرتی ہے۔

اُمّید پرست

(زیرِ طبع)

والتیر

ترجمہ: بشیر ساجد

یہ فرانس کے عظیم طنز نگار والتیر کے شاہکار: کینڈیڈ، کا ترجمہ ہے۔ کینڈیڈ ایک ایسے جوان کی کہانی ہے جو دُنیا میں اِس سوال کے حل کی غرض سے نکلا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ اِنسانی زندگی کے والتیر نے جس چابک دستی سے لتّے لیے ہیں، وہ طنز نگاری کی معراج ہے۔

رودرپریاگ کا آدم خور

کرنل جم کاربٹ

ترجمہ: جاوید شاہین
۲۶۰۰

کرنل جم کاربٹ ہندوستان کے مشہور ترین شکاری تھے اور شکار کی داستانیں لکھنے میں انھیں ایسا کمال حاصل تھا کہ انھیں انگریزی کا اعلیٰ درجے کا ادیب سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے خوں خوار چیتے کی مسلسل کہانی پیش کی گئی ہے جو اپنی چالاکی اور ہیبت ناکی میں بڑے بڑے شیروں کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ آٹھ سال تک اس چیتے نے پانچ سو مربع میل کے علاقے میں ایک تہلکہ مچائے رکھا اور کاربٹ کو اُسے مارنے میں دو سال محنت کرنی پڑی۔ آخر ستّر دن کے طویل تعاقب کے بعد یہ اُس کے ہاتھ چڑھا۔

یہ ایک ولولہ انگیز و حیرت افروز کتاب ہے۔

شیر آیا! شیر آیا!

کاربٹ، اینڈرسن اور دوسرے عظیم شکاری

۳۲۵

شیر کا شکار انسان کی شجاعت کو ہمیشہ سے للکارتا رہا ہے۔ دُنیا کے چند عظیم ترین شکاریوں کے قلم سے ان کے عظیم ترین شکاروں کی لرزہ خیز کہانیاں سُنیے۔ یہ کہانیاں اتنی دل چسپ ہیں کہ اچھے اچھے افسانوں کو مات کرتی ہیں جنگل کی دہشت اور انسانوں کی جرأت میں رچے بسے یہ قصّے آپ کے لہو کو گرم کریں گے؛ اُسے تازہ کریں گے۔

باز آؤ اور زندہ رہو

زندہ کتابیں ۳/۰۰
مجلد اڈیشن ۷/۰۰

حنیف رامے

حنیف رامے کے نکتہ رس اور بے خطر قلم سے اُردو میں ایک نئی روایت کی بسم اللہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس روایت کی جڑیں افراد و ملت کے قلب و قالب میں تراز ہو گئیں۔ اداریے لکھنا کوئی نئی بات نہیں، لیکن ایسے اداریے جنم دینا، جو نظر کی صداقت اور فکر کی جرأت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہوئے دلکشی و دلچسپی سے بھی معمور ہوں حنیف رامے ہی سے خاص ہے۔ اس مجموعے میں ان کے سیکڑوں میں سے ۴۸ منتخب اداریے شامل ہیں جو افراد و ملت کو خلقِ جدید کی دعوت دیتے ہیں ــــ

جہاں گردی کی واپسی (اوڈیسی)

(زیرِ طبع)

ہومر

ترجمہ : محمد سلیم الرحمٰن

ہومر دُنیا کا اوّلین بڑا شاعر تھا، جس کے مرتبے کو دانتے اور شیکسپیئر ہی پہنچتے ہیں۔ اوڈیسی اُس کا اتنا بڑا تخلیقی شاہکار ہے کہ صدیوں کے ہنگاموں نے اُس کی تازگی اور توانائی کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ جہاں گردی کی یہ عظیم داستان آج بھی اسی طرح ولولہ آفریں ہے جس طرح یہ قدیم یونان کے جیالے جوانوں کے لیے تھی۔

غزلیں

(زیرِ طبع)

منیر نیازی

یہ اُردو کے اُس شاعر کی غزلیں ہیں، جس کی لَے میں ایسا آہنگ اور ایسا درد ہے گویا اس دَور کی ترجمانی کے لیے رُوحِ ازل نے اسی کو منتخب کیا ہے۔

بہترین شاعری، افسانے، مقالے، مباحثے

ادب کے انتخابات مرتب اور شائع کرنا کوئی ایسا نیا اقدام نہیں لیکن انتخابات اگر سلیقے سے کیے جائیں تو ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انتخابات کے ذریعے جہاں ایک عام قاری کو ایک خاص عرصے میں شائع ہونے والی چیدہ چیدہ تحریریں یکجا مل جاتی ہیں، وہاں ادب کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے ادب کے تازہ رجحانات کا اندازہ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

برِعظیم پاک و ہند کی معروف ادبی تنظیم: حلقۂ اربابِ ذوق (لاہور) نے ۱۹۶۲ء کے اُردو ادب کو چار عنوانات کے تحت منتخب کیا ہے:۔

(۱) ۱۹۶۲ء کی بہترین شاعری:

فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، فراق گورکھپوری، صوفی تبسم، اختر الایمان، ناصر کاظمی، قیوم نظر، مجید امجد، منیر نیازی، وغیرہ۔

(۲) ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانے:

عصمت، بیدی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، انتظار حسین، مشتاق احمد یوسفی، عبداللہ حسین، وغیرہ۔

(۳) ۱۹۶۲ء کے بہترین مقالے:

محمود شیرانی، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، شاہد احمد دہلوی، مظفر علی سیّد، حنیف رامے، ریاض احمد، علی عباس جلالپوری، وغیرہ۔

(۴) کچھ تو کہیے (اہم ادبی بحثیں):

آج کا طرزِ احساس، ادب میں ہم عصری، اُردو شعری تجربہ اور نیا علمی شعور، اسلام اور ماتھالوجی، وغیرہ

شاعری ۱/۵۰ افسانے ۳/۰۰ مقالے ۱/۵۰ بحثیں ۱/۰۰

(اُمید ہے، یہ انتخابات ہر سال مرتب اور شائع ہوتے رہیں گے)

عنقریب آنے والی زندہ کتابیں

جہاں گرد کی واپسی	ہومر	(ادبِ عالیہ)
دس پیغمبر	بشیر احمد سعدی	(سوانح)
غزلیں	منیر نیازی	(شاعری)
اپنی نگریا	ممتاز شیریں	(افسانے)
ایسی بلندی ایسی پستی	عزیز احمد	(ناول)

کچھ دیر بعد شائع ہونے والی زندہ کتابیں

خوشی بھی، انسان بھی	بیرن وُولف	(نفسیات)
دُنیا کے بڑے بڑے شہر	انتخاب	(سیر و سیاحت)
گُڑ کی گزک	اِنتظار حسین	(مضامین)
سائنسی کہانیاں	مرتبہ: محمد سلیم الرحمٰن	(افسانے)
بین الاقوامی معلومات	مرتبہ: رہبر	(عام)
سیاسیات کی ابجد	ہیرلڈ لاسکی	(سیاسیات)
نفسیات سب کے لیے	محمد اقبال سلطان	(نفسیات)
مہدی سوڈانی	حبیب اشعر	(سوانح)
تنقید کی ضرورت	مظفر علی سید	(تنقید)
بہترین ہسپانوی افسانے	ترجمہ: رحیم	(کہانیاں)
کھویا ہوا اُفق	محمد خالد اختر	(مضامین)
اُمید پرست (کینڈیڈ)	والتیئر	(ناول)
آزاد شیرنی	جوئے ایڈمسن	(کہانی)
ربیقہ	دموریر	(ناول)